مجلسِ ادارت

فہرست مضمون نگارانِ معارف

جلد ۱۱۷

(بترتیب حروف تہجی)

ماہ جنوری ۱۹۷۶ء تا جون ۱۹۷۶ء

فہرست مضامین معارف

جلد ۱۱۷

(بہ ترتیب حروف تہجی)

ماہ جنوری ۱۹۷۶ء تا جون ۱۹۷۶ء

1

جلد ۱۱۷ — ماہ جنوری ۱۹۷۶ء مطابق ماہ محرم الحرام ۱۳۹۶ھ — عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

طوطیِ شکر مقال بلکہ طوطیِ ہند امیر خسرو کا سات سو سالہ جشن ۱۹۷۵ء میں مختلف ملکوں میں منایا گیا، روس اور پاکستان مین منایا جا چکا ہے، جنوری ۱۹۷۶ء میں دہلی میں اُن پر ایک اعلیٰ سمینار ہونے والا ہے، وہ ان عبقریون میں ہیں جن پر دنیا کو ناز ہو سکتا ہے، وہ یک عدیم المثال شاعر تھے، بہت اچھے نثر نگار بھی، قابل قدر مورخ بھی، بڑے دل نواز صوفی بھی، جان نثار مرید بھی، اعلیٰ قسم کے ماہر موسیقی بھی، محبوب شاہی ندیم بھی، اطاعت گذار فرزند بھی، شفیق باپ بھی، مخلص محب وطن بھی، بہت ہی روادار، فراخدل اور وسیع المشرب انسان بھی۔

ان کے معاصروں مین ضیاء الدین برنی نے لکھا تھا کہ ان کے ایسا جامع شخص اور شاعر پہلے نہ پیدا ہوا اور نہ قیامت تک ہو سکے گا، فارسی تذکرہ نگاروں مین دولت شاہ سمرقندی نے ان کو خاتم الکلام فی آخر الزمان قرار دیا ہے، موجودہ دور مین علامہ شبلیؒ ان کے سب سے بڑھ کر قدر دان ہوے، ان کی راے ہے کہ ہندوستان میں چھ سو برس سے آج تک اس درجہ کا جامعِ کمالات نہیں پیدا ہوا، اور سچ پوچھو تو اس قدر مختلف اور گوناگوں اوصاف کے جامع ایران اور روم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو چار ہی پیدا کئے ہونگے، انھون نے اپنی مشہور تصنیف شعر العجم جلد دوم کے ایک باب میں اپنی ایجاز نویسی کا کمال دکھا کر ان کا جو ناقدانہ تجزیہ کیا ہے، وہ ان کے ادبی شاہکاروں میں ہے، اب تک اسی ایجاز کا اطناب

ہو رہا ہے، اسی کے ذریعہ ہندوستان اور غالباً ایران میں بھی امیر خسرو صحیح طور پر سمجھے گئے۔

حیدر آباد کے آخری نظام کی سرپرستی میں امیر خسرو کی مثنویوں خصوصاً ان کے خمسہ کی ترتیب و تدوین کا کام ہوا تھا، تو ان کے فاضل اجل مقدمہ نگاروں نے انکی مثنوی نگاری کے اعلیٰ فن کی ایسی تنقیح کی کہ اب تک یہ مثنویاں اسی کی بدولت سمجھی جا رہی ہیں، انگریزی میں ڈاکٹر محمد وحید مرزا نے لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو لکھ کر انکے جامع اوصاف کو اور بھی زیادہ روشن کیا، اس مین ان سے متعلق تفصیلی معلومات فراہم کر دیے گئے ہیں، کسی اور کتاب میں نہیں ملیں گے۔

اسوقت ہندوستان مین مختلف رسائل و جرائد میں امیر خسرو پر برابر مضامین نکل رہے ہیں، کلکتہ کے انگریزی سہ ماہی رسالہ انڈو ایرانیکا، اور لکھنؤ کے ماہانہ رسالہ نیا دور کے اچھے خصوصی نمبر بھی شائع ہوئے ہیں، ہماری مرکزی حکومت کی سرپرستی میں ان کا سات سو سالہ جشن منانے کیلئے کمیٹیاں بھی بنائی گئی ہیں، اسکے مطبوعات و اطلاعات کے محکمہ کی طرف سے انگریزی اور اردو مین ہندوستان کے مشہور اہل قلم کے مضامین کی دو جلدیں بھی تیار کر لی گئی ہیں، صدر جمہوریہ جناب فخر الدین علی احمد کی صدارت میں جو کمیٹی بنی ہے اسکی نگرانی میں بھی اہم مضامین جمع کئے جا چکے ہیں، اسکے روح رواں بمبئی کے گورنر جناب علی یاور جنگ بہادر ہیں، امید کہ ان مختلف جلدوں میں امیر خسرو کے کمالات کے وہ پہلو بھی سامنے آئیں گے جو اب تک نہیں آسکے ہیں۔

مگر اب تک کہین سے یہ خبر نہیں ملی ہے کہ امیر خسرو کی غیر مطبوعہ تصانیف کی طباعت کا بھی اہتمام کیا جا رہا ہے، ان کا پہلا دیوان تحفۃ الصغر ابھی تک مخطوطہ ہی کی شکل میں مطالعہ کیا جاتا ہے، انکا دوسرا دیوان وسط الحیواۃ علی گڈھ میں چھپا تھا، اس مین جناب فضل احمد حافظ کا بہت ہی مبسوط اور فاضلانہ مقدمہ بھی تھا، مگر اسکی اشاعت اس لئے رکوا دی گئی کہ اس میں امیر خسرو کے اس دور کے سارے کلام کو جمع نہیں کیا جا سکا تھا، غرۃ الکمال اور نہایۃ الکمال نولکشور پریس لکھنؤ سے بہت ہی معمولی طریقہ

چھاپ دئے گئے تھے، مگر اب وہ بھی دستیاب نہیں ہیں، بقیہ نقیہ کو تو کسی نے چھاپنے کی زحمت بھی نہیں کی، اعجاز خسروی کی پانچ جلدیں نولکشور پریس لکھنؤ میں چھاپی گئی تھیں، مگر اب وہ بھی نہیں ملتی ہیں، افضل الفوائد بھی طبع نہیں ہو سکی ہے، علی گڑھ سے انکی جو مثنویاں طبع ہوئی تھیں، وہ بھی اب آسانی سے نہیں ملتی ہیں، نولکشور پریس نے بھی حال ہی میں غزلیاتِ امیر خسرو کے نام سے جو اڈیشن شائع ہوا ہے، اس میں امیر خسرو کی تمام غزلیں موجود نہیں ہیں، البتہ لاہور سے ان کی غزلیات کی تین جلدیں ٹائپ میں بہت ہی عمدہ طباعت کے ساتھ شائع کی گئی ہیں۔

امیر خسرو کا جو سات سو سالہ جشن اکتوبر ۱۹۷۵ء میں پاکستان میں منایا گیا، اس کا ذکر معارف کے آئندہ صفحات میں آئے گا، یہ جشن جہاں بھی منایا گیا یا منایا جائے گا، وہاں کافی اخراجات ہوئے یا ہوں گے، لیکن یہی اخراجات ان کی تمام تصانیف کو عمدہ طریقہ سے چھاپنے میں صرف کئے جاتے یا کئے جائیں تو یہ ان کی اصلی خدمت ہے، بیدل عظیم آبادی کی تصانیف افغانستان میں بہت ہی اعلیٰ طباعت کے ساتھ شائع ہوئی ہیں، اس سے ہمارے ملک کے علمی حلقہ کی اہانت ہوئی کہ جو کام یہاں ہونا چاہئے تھا، وہ باہر ہوا، کہیں امیر خسرو کی تصانیف کے سلسلہ میں بھی یہ شرمندگی محسوس نہ کرنی پڑے، اگر ان کی ساری تصانیف عمدہ لکھائی چھپائی کے ساتھ ارباب علم کے ہاتھوں پہونچ جائیں تو ان کی شاعری، نثر نگاری، راہ سلوک میں ان کے سوز عشق الٰہی، انکی مذہبی رواداری، ان کی وطن پروری، انسان دوستی اور فن موسیقی میں انکی ایجاد پسندی کا جائزہ لے کر ان کی عبقریت کو اور بھی زیادہ روشن کرنے میں بڑی آسانی ہو جائے گی۔

مقالات

بناتِ اسلام
کی
علمی و دینی خدمات

(۲)

از جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوری، البلاغ، بمبئی

اجازۃ بالروایۃ

معلوم ہو چکا ہے کہ بہت سے شیوخ حدیث نے عورتوں کو اپنی طرف سے روایت کی اجازت دیکر ان کو اپنے حلقۂ تلمذ میں شامل کیا ہے، اسی طرح بہت سی شیخات حدیث نے مردوں کو اپنی طرف سے روایت کی اجازت دی ہے، اور محدثین نے اس شرف وفضیلت پر فخر کیا ہے، دو ایک مثالیں اس کی بھی ملاحظہ ہوں۔

امام تقی الدین فاسی مکی نے لکھا ہے کہ ام محمد سیدہ بنت شیخ رضی الدین نے ہمارے شیخ حافظ زین الدین عبد الرحیم عراقی کو روایت کی اجازت دی ہے، اور ام محمد عائشہ بنت ابراہیم دمشقیہ نے امام برہان الدین ابراہیم بن احمد شامی کو اجازت دی ہے[1]

ابن خلکان نے ام المؤید زینب حرہ سے اجازت پانے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

---

[1] العقد الثمین ج ۸ ص ۲۵۲،

ولنا منها اجازة کتبتها	ام المؤید زینب سے ہم کو اجازت
فی بعض شھور سنة	حاصل ہے جسے انھوں نے ۶۱۶ھ
ست عشر وستمایة[1]	کے کسی مہینہ میں لکھا تھا۔

اجازت بالروایہ کا طریقہ محدثین میں بہت عام تھا، بلکہ آج بھی اطراف پڑھ کر مختلف کتبِ حدیث کی سند و اجازت دیجاتی ہے۔

مختلف شہروں میں درس حدیث عام طور سے محدثات و شیخات کی مجلسِ درس ان کے مکان میں منعقد ہوتی تھی، اور طلبۂ حدیث وہیں حاضر ہو کر استفادہ کرتے تھے، جیسا کہ خطیب بغدادی نے ان سے روایت کے سلسلہ میں ان کی قیام گاہوں کی نشان دہی کی ہے، مگر ان میں کئی عالمات و فاضلات نے مختلف شہروں میں بھی درس دیا ہے، اور دینی علوم کو چلتے پھرتے عام کیا ہے، خلدیہ بنت جعفر بن محمد بغداد کی باشندہ تھیں، ایک مرتبہ وہ بلادِ عجم کے سفر میں نکلیں تو مقام دینور میں ان سے خطیب ابوالفتح منصور بن ربیعہ زہری نے حدیث کی روایت کی،[2] مسندۃ الوقت ست الوزراء بنت عمر تنوخیہ نے متعدد بار مصر اور دمشق میں صحیح بخاری اور مسند شافعی کا درس دیا، زینب بنت احمد مقدسیہ نے مصر اور مدینہ منورہ میں تعلیم دی، آمنہ بنت عنان نے بغداد اور موصل میں مجلس درس منعقد کر کے حدیث کی روایت کی، تقی الدین فاسی نے زینب بنت قاضی مکہ سے مقام بدر میں سماع کیا۔

محدثات و شیخات میں باہمی سماع و روایت، گذر چکا ہے کہ صدر اول میں جب احادیث کی روایت و تدوین کا سلسلہ شروع ہوا تو خواتین نے ایک دوسرے سے

؎ ابن خلکان ج ا ص ۲۱۶ ؎ تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۴۴۴

روایت کی، پھر ان کی احادیث مردوں تک پہونچیں، یہ سلسلہ بعد کے ادوار میں بھی جاری رہا، اور شیخات و محدثات نے اپنی ہم جنسوں میں دینی تعلیم پھیلائی، اور ان کو حدیث کا درس دیا، چنانچہ مسندۃ الشام زینب بنت کمال الدین احمد مقدسیہ کو عجیبہ باقداریہ نے اپنی مرویات کی اجازت دی، فاطمہ بنت سلیمان انصاریہ نے کریمہ بنت احمد مروزیہ سے احادیث کا سماع کیا، عائشہ بنت معمر اصفہانیہ نے فاطمہ جوزدانیہ کی مجلس درس میں حاضر ہو کر ان سے روایت کی، شیخہ معمرہ زینب بنت کی نے ست الکعبۃ سے سماع کیا، سلطان صلاح الدین ایوبی کی پوتی شہزادی فاطمہ بنت الملک المحسن احمد نے بھی ست الکعبہ سے حدیث کا سماع کیا، فاطمہ بنت احمد سامریہ بغدادیہ نے حوازیہ بنت عیسیٰ خزاز سے روایت کی،

علم حدیث میں تصانیف، بناتِ اسلام نے علم حدیث کی اشاعت میں صرف درس و تدریس اور روایت ہی سے کام نہیں لیا بلکہ محدثین کی طرح انھوں نے بھی اس فن میں مستقل کتابیں تصنیف کیں، اور اسلامی کتب خانوں میں اپنی کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ چھوڑا، اپنی مرویات کو کتابی شکل میں مدون کیا، فن رجال میں کتابیں لکھیں، کتبِ احادیث کو نقل کیا، ان میں بہت سی عالمات کتابوں کے ضبط و مقابلہ اور تصحیح میں خاص ملکہ اور شہرت رکھتی تھیں، امام ذہبی نے عجیبہ بنت حافظ محمد بن ابو غالب باقداریہ بغدادیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے اساتذہ و شیوخِ حدیث کے حالات دس جلدوں میں لکھے تھے،

ولھا مشیخة فی عشرة	شیوخ و اساتذہ کے تذکرہ میں انکی ایک
اجزاء[1]	کتاب دس جلدوں میں ہے۔

؎ العبر ج ۵ ص ۱۹۴

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عجیبہ باقداریہ کے شیوخ کی تعداد کس قدر زیادہ تھی،

ام محمد فاطمہ خاتون بنت محمد خطیبہ اصفہانی کو تصنیف و تالیف میں بڑا اچھا سلیقہ حاصل تھا، انھوں نے بہت سی عمدہ عمدہ کتابیں لکھی تھیں جن میں الرموز من الکنوز پانچ جلدوں میں تھی، امام فاسی نے تصریح کی ہے،

ولها طرق حسنة فی الوعظ	وعظ گوئی میں ان کو اچھا ملکہ حاصل
وتوالیف حسنة کتابها	تھا، انھوں نے اچھی اچھی کتابیں لکھیں
الموسوم بالرموز من	جیسے ان کی کتاب الرموز من الکنوز
الکنوز یقارب خمس	تقریباً پانچ جلدوں میں ہے،
مجلدات [1]	

ام محمد بن فاطمہ بنت نفیس الدین محمد بہنسیہ مکیہ نے حدیث اور دوسرے علوم میں بہت سی کتابیں لکھیں، فاسی نے لکھا ہے،

کتبت بخطها الکثیر من الحدیث والعلم [2]	علم حدیث اور دوسرے علم میں انھوں نے اپنے قلم سے بہت کچھ لکھا تھا،

خدیجہ بنت محمد شاہجہانیہ بغدادیہ نے اپنے استاذ حدیث ابن میمون کی جملہ مرویات و احادیث کو ایک الگ کتاب میں جمع کیا تھا، [3]

ام محمد شہدہ بنت کمال الدین عمر کو بہت سی حدیثیں زبانی یاد تھیں، انھوں نے بہت سی احادیث کتابی شکل میں یکجا کرلی تھیں، [4] کریمہ بنت احمد مروزیہ کو اپنی کتابوں کو ضبط و مقابلہ کے ذریعہ درست کرنے اور اپنے نسخوں کو مقابلہ کرکے تصحیح کرنے میں بڑا اچھا سلیقہ حاصل تھا، وہ بڑی سمجھ بوجھ کی محدثہ تھیں، [5]

خدیجہ بنت شیخ شہاب الدین مکیہ اور ان کے معاصر علماء و فضلاء میں خط و کتابت کے

[1] العقد الثمین ج ۸ ص ۲۰۲ [2] ایضاً [3] العبر ج ۳ ص ۲۴۶ [4] ذیل العبر ذہبی ص ۹۴ [5] ایضا ج ۳ ص ۲۵۴

ذریعہ دینی امور اور علمی مسائل میں بحث و تحقیق جاری رہا کرتی تھی، وہ اس سلسلہ میں چھوٹے بڑے رسائل لکھا کرتی تھیں،

عائشہ بنت عمارہ بن یحییٰ افریقہ کے شہر بجایہ کی رہنے والی تھیں، ان کا خط نہایت پاکیزہ اور خوبصورت تھا، انھوں نے ایک کتاب اپنے ہاتھ سے نقل کی تھی، جو اٹھارہ جلدوں میں تھی، غبرینی کا بیان ہے،

وکان لها خط حسن رأیت	ان کا خط بہت عمدہ تھا، میں نے ثعلبی
کتاب الثعلبی بخطها فی	کی ایک کتاب ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی
ثمانیة عشر جزاء [1]	دیکھی ہے جو اٹھارہ جلدوں میں ہے۔

ان چند مثالوں سے بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ عالمات و فاضلات نے تصنیف و تالیف اور کتابت و تحریر کے شعبہ میں بھی اپنی اچھی یادگار چھوڑی ہے، افسوس ہے کہ بعد میں انکی تصانیف سے اعتناء نہیں کیا گیا جس کے نتیجہ میں ان کی کوئی کتاب آج ہمارے سامنے نہیں ہے،

محدثات کی کتب و مرویات پر کتب تخریج،

محدثات کی کتابوں اور ان کی مرویات کی قبولیت و اہمیت کے پیش نظر بہت سے علماء و محدثین نے ان پر تخریج لکھی، اور ان کو اصل قرار دیکر اپنی مرویات کو ان سے ملایا۔

اللہ تعالےٰ نے بنات اسلام کو یہ شرف بھی عطا فرمایا ہے کہ ان کی کتابوں اور مرویات پر ان کے تلامذہ یا بعد کے علماء نے تخریج کی ہے، امام فاسی نے ام الفضل خدیجہ بنت تقی الدین علی بن ابوبکر طبریہ مکیہ کے حال میں لکھا ہے، کہ

وخرّج لها وحدّثت [2]	انکی احادیث پر تخریج کی گئی، اور انھوں نے حدیث کا درس دیا،

[1] عنوان الدرایہ فیمن کان من العلماء فی المائۃ السابعۃ ببجایہ ص ۲۰۴ [2] العقد الثمین ج ۸ ص ۲۳

اسی طرح ام احمد زینب بنت احمد بن ابوبکر محمد طبریہ مکیہ کے بارے میں بیان کیا ہے:

وخرج لها ایضاً وحدثت[1] — ان کی احادیث پر بھی تخریج کی گئی اور انھوں نے حدیث کا درس دیا،

افسوس کہ آج نہ محدثات کی کتابوں کا پتہ ہے، اور نہ ان کی کتابوں پر تخریج کی ہوئی کتابوں کا پتہ ہے،

فقہ وفتویٰ ان محدثات وعالمات میں بہت سی فقیہات ومفتیات بھی گذری ہیں جنھوں نے کتاب وسنت کے ساتھ فقہ وفتویٰ میں کمال حاصل کیا ہے، اور فقیہہ ومفتیہ کی حیثیت سے شہرت پائی ہے، اور مسلمانوں نے ان کے تفقہ وافتاء پر کامل اعتماد کے ساتھ عمل کیا ہے، امام ابن قیم کی تصریح کے مطابق تقریباً بائیس ۲۲ صحابیات فقہ وفتویٰ میں مشہور تھیں جن میں امہات المومنین شامل تھیں، اور ان سب میں ام المومنین حضرت عائشہؓ فقیہہ امت کا لقب رکھتی تھیں، زینب بنت ابوسلمہ تفقہ میں اس قدر آگے تھیں کہ مشہور تابعی ابورافع جب بھی مدینہ منورہ کی کسی فقیہہ کو یاد کرتے تھے، تو زینب بنت ابوسلمہ پہلے یاد آتی تھیں،

مشہور حنفی فقیہ وعالم شیخ علاء الدین سمرقندی متوفی ۵۳۹ھ مصنف تحفۃ الفقہاء کی صاحبزادی فاطمہ فقیہہ جلیلہ تھیں، ان کے شوہر شیخ علاء الدین کاسانی متوفی ۵۸۷ھ نے تحفۃ الفقہاء کی شرح البدائع والصنائع کے نام سے لکھی، فاطمہ کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ شرح لکھنے کے درمیان جب کبھی ان کے شوہر سے کوئی غلطی ہوجاتی تھی تو وہ ان کو متنبہ کرکے تصحیح کرادیتی تھیں، فاطمہ اپنے والد اور شوہر کے ساتھ باقاعدہ فتویٰ نویسی بھی کرتی تھیں۔

وکانت الفتوی تاتی فتخرج — فتاوے پر فاطمہ، ان کے والد اور

---

[1] العقد الثمین ج ۸ ص ۲۲۱،

وعلیها خطُّها وخط أبیها وخط زوجها۔ — ان کے شوہر تینوں کے دستخط ہوا کرتے تھے۔

قاضی ابوعبداللہ حسین بن اسمٰعیل محاملی کی صاحبزادی امۃ الواحد ستیتہ نے اپنے والد اور اسمٰعیل بن عباس وراق عبدالغافر بن سلامۃ حمصی، ابوالحسن مصری، حمزہ ہاشمی وغیرہ سے حدیث کا سماع کیا تھا، نہایت فاضلہ اور صالحہ عورت تھیں، فرائض، حساب، نحو اور دیگر علوم وفنون میں مہارت رکھتی تھیں، اور خاص بات یہ تھی کہ

حفظت القرآن والفقه... وبرعت فی مذهب الشافعی وکانت تُفتی مع ابی علی بن ابی هریرة[1] — انھوں نے قرآن اور فقہ کو زبانی یاد کیا تھا، اور فقہ شافعی میں ان کو کمال حاصل تھا، وہ شیخ ابوعلی بن ابوہریرہ کے ساتھ فتویٰ دیا کرتی تھیں،

ابن جوزی نے بنت المحاملی کے بارے میں یہاں تک لکھا ہے۔

وکانت فاضلة من احفظ الناس للفقه علی مذهب الشافعی۔ — وہ نہایت فاضلہ اور مذہب شافعی کی فقہ کی سب سے بڑی حافظ تھیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دور میں بنت المحاملی سے زیادہ فقہ شافعی کا جاننے والا دوسرا کوئی نہیں تھا، اسی لیے وہ امام ابوعلی بن ابوہریرہ کے ساتھ فتویٰ دیا کرتی تھیں

ام عیسیٰ بنت ابراہیم بن اسحاق بغدادی بھی بغداد میں مفتیہ تھیں، خطیب نے لکھا ہے۔

---

[1] العبر ج ۳ ص ۴، المنتظم ج ۶ ص ۹، صفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۲۹۰

ذکر لی انها کانت فاضلة عالمة تفتی فی الفقه — ان کے بارے میں مجھ سے بیان کیا گیا ہے کہ وہ عالمہ فاضلہ تھیں اور فقہی مسائل میں فتویٰ دیا کرتی تھیں،

ابن جوزی نے بھی ام عیسیٰ کے فتویٰ دینے کی تصریح تقریباً ان ہی الفاظ میں کی ہے۔[2] شیخ تقی الدین ابراہیم بن علی واسطی کی صاحبزادی امۃ الرحمٰن تفقہ اور فتویٰ میں خاص ملکہ اور شہرت رکھتی تھیں، اور ست الفقہاء کے لقب سے یاد کی جاتی تھیں۔[3] اسی طرح امیر سید شریف علاء الدین علی بن خطیب شرف الدین احمد کی بہن شریفہ بھی فقہ و فتویٰ میں مشہور تھیں،[4] ام زینب فاطمہ بنت عباس بغدادیہ شیخہ، عالمہ فقیہہ زاہدہ، قانتہ اور خواتین زمانہ کی سیدہ تھیں۔[5]

فقیہ یوسف بن یحییٰ اندلسی کی بہن فاطمہ بنت یحییٰ اندلسیہ قرطبیہ عالمہ فاضلہ اور پرہیزگار ہونے کے ساتھ ساتھ فقیہہ بھی تھیں اور بھائی کی طرح بہن بھی اس فن میں شہرت رکھتی تھیں، ان کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ان کے جنازہ میں جس قدر زیادہ مسلمان شریک ہوئے اس سے پہلے اس کی نظیر نہیں ملتی۔[6]

حفظ قرآن، تجوید اور تفسیر

ان محدثات و عالمات میں بہت سی حافظات قاریات، مقریات اور مفسرات تھیں، جنھوں نے حدیث کی طرح قرآن کی خدمت میں بہترین کارنامے انجام دیئے ہیں، حفصہ بنت سیرین نے بارہ برس کی عمر میں قرآن کریم کو مع اس کے معانی و مطالب کے حفظ کر لیا تھا،[7] فن تجوید و قرات میں بھی وہ مہارت

[1] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۴۴۲ [2] المنتظم ج ۶ ص ۳۱۵ [3] ذیل العبر ذہبی ص ۱۴۰ [4] ذیل العبر حسینی ص ۲۸۴ [5] ذیل العبر ذہبی ص ۸۰ [6] بغیۃ الملتمس ص ۵۳۱ [7] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۴۰۹

رکھتی تھیں، ہشام راوی کا بیان ہے، جب کبھی ان کے بھائی محمد بن سیرین کو قرات کے بارے میں کوئی شبہ پڑ جاتا تو اپنے شاگردوں سے کہتے کہ جاؤ حفصہ سے پوچھو کہ وہ اسے کیسے پڑھتی ہیں، حفصہ ہر رات نصف قرآن پڑھا کرتی تھیں۔[1]

فاطمہ نیشاپوریہ مشہور مفسرہ تھیں، اور فہم قرآن میں کلام کرتی تھیں، ابن ملوک نامی ایک بزرگ کا بیان ہے کہ میں نے اس سے زیادہ بزرگ عورت نہیں دیکھی، ایک دن میں نے ان کی علمیت پر تعجب کرتے ہوئے حضرت ذوالنون مصری سے پوچھا کہ یہ عورت کون ہے، انھوں نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ کے اولیاء میں سے ایک ولیہ ہے، اور میری استاد ہے۔[2] امۃ الواحد بنت المحاملی عالمہ فاضلہ اور فقیہہ و مفتیہ کے ساتھ حافظ قرآن بھی تھیں۔

میمونہ بنت ابو جعفر مدنیہ مشہور قاریہ مجودہ تھیں، انھوں نے یہ فن اپنے والد سے حاصل کیا تھا، اور ان سے دوسرے لوگوں نے پڑھا،

امام القراء ابن جزری نے اپنی صاحبزادی سلمیٰ کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے قراءات سبعہ میں قرآن مجید حفظ کر کے سنایا تھا، اور قراءات عشرہ کی تعلیم بھی ان کے اصول کے مطابق حاصل کی تھی، وہ فن تجوید میں اس قدر آگے تھیں کہ اس زمانہ میں کوئی قاری وجود ان کی ہمسری نہیں کر سکتا تھا۔

ابن تغری بردی نے النجوم الزاہرہ میں لکھا ہے کہ خلیفہ ہارون رشید کی زوجہ زبیدہ کے محل سرا میں ایک ہزار باندیاں قرآن مجید پڑھا کرتی تھیں اور ان کی آواز شہد کی مکھیوں کی آواز کے مانند سنائی دیتی تھی، بنات اسلام نے قرآن کی خدمت اس کی کتابت

[1] صفۃ الصفوۃ ج ۴ ص ۱۶ [2] ایضاً ص ۱۰۱

کر کے بھی کی ہے، ابن فیاض نے اخبار قرطبہ میں لکھا ہے کہ شہر قرطبہ کے مشرقی علاقہ میں ایک سو ستر[1] عورتیں خط کوفی میں قرآن کریم لکھتی تھیں، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ پورے شہر قرطبہ کی عورتوں میں قرآن کریم کی کتابت کا کتنا ذوق رہا ہوگا، ہمارے ملک کے بادشاہ شاہجہان کی پوتی شہزادی شادخانم نے خط ریحان میں کمال متانت سے ایک قرآن کریم لکھا تھا جس کے آخر میں خط رقاع میں اپنا نام و نسب تحریر کیا تھا۔

وعظ و تذکیر پردہ نشینانِ علم و فضل نے وعظ و تذکیر اور خطابت کے ذریعہ خواتینِ اسلام کے ایمان و عمل کو تازگی اور رونق بخشی ہے اور ان کے ذریعہ مسلم خانوادوں اور کنبوں کی بڑی اصلاح ہوئی ہے، ان محدثات و فقیہات اور عالمات میں بڑے آن بان کی واعظہ اور خطیبہ گذری ہیں جن کی ذات سے عام عورتوں کو بہت زیادہ فیض پہونچا ہے، وہ عورتوں کے مخصوص اجتماعات میں جاکر وعظ سناتی تھیں اور ان کے یہاں عورتیں آکر وعظ سنتی تھیں، اسی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ صنفِ نازک میں ادا ہوا ہے۔

امام حسن بصری کی والدہ ماجدہ خیرہ عورتوں کے مجمع میں وعظ سنایا کرتی تھیں، حضرت اسامہ بن زید کا بیان ہے۔

رأیتُ ام الحسن تقصّ على النساء۔[1] — میں نے حسن بصری کی والدہ کو دیکھا ہے کہ وہ عورتوں میں وعظ کہتی تھیں،

معاذۃ بنت عبداللہ مشہور تابعی حضرت صلہ بن اشیم کی زوجہ بڑی عالمہ فاضلہ اور عابدہ زاہدہ خاتون تھیں، وہ عورتوں کے مجمع میں صدر نشین ہو کر ان کو وعظ سنایا کرتی تھیں جعفر بن کیسان کا بیان ہے۔

[1] طبقات ابن سعد ج ۸ ص ۳۶۷

رأیتُ معاذۃ مجبیتہ والنساء حولها[2] — میں نے معاذۃ کو دیکھا ہے کہ وہ بیٹھی وعظ سناتی ہیں اور ان کے گرد عورتوں کا حلقہ ہے۔

ام الحکم عائشہ بنت محمد بغدادیہ "الواعظہ" کے لقب سے مشہور تھیں، اور عورتوں میں وعظ کہتی تھیں، امام ذہبی نے لکھا ہے۔

وکانت صالحۃ تعظ النساء[3] — وہ نہایت بزرگ تھیں، اور عورتوں کو وعظ سناتی تھیں۔

ام احمد زلیخا بنت الیاس عزنویہ بھی "الواعظہ" کے لقب سے مشہور ہیں، خرقہ پوش عابدہ زاہدہ خاتون تھیں، گھروں میں جاکر عورتوں کو وعظ سناتی تھیں، امام فاسی کا بیان ہے۔[4]

وکانت تعظ وتلبس المرقعۃ فی دویرۃ النساء۔[5] — وہ وعظ کہتی تھیں اور خرقہ پہنکر عورتوں کے گھروں میں جاتی تھیں۔

اس سلسلہ میں شیخہ عالمہ، محدثہ، زاہدہ ام زینب فاطمہ بنت عباس بغدادیہ کی خدمات بہت اہم ہیں، ان کے وعظ و تذکیر سے صرف بغدادہی کی خواتین کو فیض نہیں پہنچا بلکہ دمشق اور مصر کی عورتوں نے بھی ان سے بڑا فیض پایا جس کی وجہ سے وہ "سیدۂ خواتین دوراں" کے لقب سے مشہور ہوئیں، امام ذہبی نے ان کے حال میں لکھا ہے کہ ان کی ذات سے عورتوں کی بہت بڑی تعداد نے نفع پایا اور گناہوں سے توبہ کی، وہ زبردست عالمہ، قانعہ اور تعلیم و تذکیر کے ذریعہ نفع رسانی کی حریص تھیں، ان میں اخلاص اور خوف خدا بہت زیادہ تھا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بھی انجام دیتی تھیں،

[2] طبقات ابن سعد ج ۸ ص ۳۰۴ [3] العبر ج ۵ ص ۱۷۸ [4] العقد الثمین ج ۸ ص ۲۳۸

ان کے ذریعہ دمشق اور مصر کی عورتوں کی اصلاح ہوئی، عوام و خواص کے دلوں میں ان کے لیے حد سے زیادہ احترام تھا، اور وہ لوگوں میں مقبول تھیں [۱]

رشد و ہدایت اور تزکیۂ نفس

ان بنات اسلام میں بہت سی اللہ والیاں تھیں جن کے نفوس قدسیہ کی برکت سے خواتین اسلام میں زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت کی روح پیدا ہوئی ہے، ان عابدات و زاہدات اور صوفیات نے اپنے تزکیۂ نفس میں بڑا کام کیا ہے، اور ان کی رباطوں اور خانقاہوں میں بھی تزکیۂ نفس، اخلاقی تربیت اور اصلاح حال کا کام ہوا ہے، اور ان کے چشمۂ فیض سے احسان و تصوف اور اخلاص و روحانیت کے دھارے بہے ہیں،

ام احمد زلیخا بن نوبہ کے متعلق معلوم ہو چکا ہے کہ وہ الواعظہ کے لقب سے مشہور تھیں اور خرقہ پوشی میں زندگی بسر کی، وہ عورتوں کے یہاں جا جا کر وعظ و تلقین کیا کرتی تھیں، فاطمہ بنت حسین رازیہ بھی الواعظہ مشہور تھیں، ساتھ ہی متعبدہ اور صوفیہ تھیں ان کے بارے میں ابن جوزی نے لکھا ہے،

لها رباط تجتمع فيه الزاهدات [۲] — انکی خانقاہ تھی جس میں عابد و زاہد عورتیں جمع ہوا کرتی تھیں

تاج النساء بنت رستم اصفہانیہ مکہ مکرمہ میں مجاورت و اقامت اختیار کرکے زہد و تصوف میں زندگی بسر کرتی تھیں بلکہ بقول امام تقی الدین فاسی کی

وكانت مقدمة الصوفية بها [۳] — وہ مکہ مکرمہ کی صوفیہ میں سب سے آگے تھیں۔

اسی طرح مکہ مکرمہ کی مشہور شیخہ عالمہ زاہدہ صفیہ بنت ابراہیم کے بارے میں ان کا بیان ہے،

شيخة الصوفيات خادمة الفقراء بالحرمين الشريفين [۴] — وہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں صوفیات کی شیخہ اور فقراء کی خادمہ تھیں۔

۱؎ ذیل العبر ذہبی ص ۰۰ ۲؎ المنتظم ج ۱۰ ص ۔ ۳؎ العقد الثمین ج ۸ ص ۱۹۲ ۴؎ ایضاً ص ۲۵۹ -

یعنی صفیہ بنت ابراہیم حرمین شریفین کی عابدات و زاہدات اور صوفیات کی مرشدہ تھیں، اور ان کی اصلاح و تربیت کی خدمت بھی انجام دیتی تھیں، ساتھ ہی یہاں کے اولا مرد فقراء اور عباد و زہاد کی خدمت بھی کرتی تھیں، زہرہ بنت محمد بن احمد کو مورخوں نے شیخہ صالحہ صوفیہ کے القاب سے یاد کیا ہے، دمشق میں ان کے نام سے رباط الزہرہ تھی، وہ اسی سے متصل سکونت کرتی تھیں اور اپنی خانقاہ میں رہنے والی صوفیات و زاہدات کو تعلیم و تربیت دیتی تھیں۔

فاطمہ بنت محمد قسطلانیہ مکیہ محدثہ ہونے کے ساتھ زبردست صوفیہ بھی تھیں انھوں نے خرقۂ تصوف شیخ نجم الدین تبریزی سے پہنا تھا، اور جن اعیان محدثین نے ان سے پڑھا ان کو انھوں نے خرقۂ تصوف پہنایا۔ [۱]

فاطمہ بنت عبد الرحمٰن حرانیہ کا لقب صوفیہ ہے، ان کے احسان و تصوف کے بارے میں خطیب بغدادی اور ابن جوزی کا بیان ہے کہ وہ صوفیہ کے لقب سے مشہور تھیں، کیونکہ صوف (اونی کمبل) ہی پہنتی تھیں اور ساٹھ سال سے زائد مدت تک اپنے مصلیٰ پر بلا بستر کے سوئی تھیں [۲]۔

ان چند مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ بنات اسلام کا وجود مسعود دینی علوم و فنون اور اسلامی اعمال کے ہر میدان میں نمایاں رہا ہے، اور اسلامی زندگی کا کوئی گوشہ ان سے خالی نہیں ہے، حتیٰ کہ زہد و تصوف اور خانقاہی زندگی میں بھی ان کی ذات بڑی پرکشش نظر آتی ہے، اور اس میں انھوں نے عورتوں کے ساتھ مردوں کی بھی خدمت کی ہے۔

۱؎ العقد الثمین ج ۸ ص ۲۵۹ ۲؎ ایضاً ص ۲۸۰ ۳؎ تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۴۴۱ ۴؎ المنتظم ج ۶ ص ۱۹۲

مدرسوں اور خانقاہوں کی تعمیر اور ان میں تعلیم و تربیت

چوتھی صدی کے بعد موجودہ مدارس کا انتظام ہوا، اس سے پہلے عام طور سے اہل علم اپنے مکانوں محلہ کی مسجدوں اور جامع مسجدوں میں تعلیمی حلقے قائم کرتے تھے، جن کی افادیت آج کل کے جامعات اور دار العلوموں سے کسی طرح کم نہ تھی، قدیم زمانہ میں عالمات و فاضلات نے عام طور سے اپنے اپنے گھروں میں اپنے طلبائے درس قائم کئے مگر بعد میں جب باقاعدہ مدارس کا رواج ہوا تو انھوں نے نسوانی مدرسے جاری کئے۔

اندلس کی مشہور عالمہ فاضلہ غالیہ بنت محمد عورتوں کو ہر قسم کی تعلیم دیتی تھیں، اسی وجہ سے المعلمہ کے لقب سے مشہور ہوئیں[1]۔ اندلس ہی کی دوسری عالمہ مریم بنت ابویعقوب شلبیہ تھیں، جنھوں نے اندلس سے مکہ مکرمہ جا کر حج ادا کیا تھا اور حاجیہ مشہور تھیں ان کے حالات میں لکھا ہے کہ

کانت تعلم النساء الادب	وہ عورتوں کو علم و ادب کی تعلیم
وتحتشم لدینھا وفضلھا	دیتی تھیں اور دینداری و بزرگی
وعمرت عمراً طویلاً[2]	کا بڑا خیال رکھتی تھیں، انھوں نے
	طویل عمر پائی تھی،

ان دونوں فاضلات کے باقاعدہ نسوانی مدرسے تھے، جن میں وہ مستقل طور سے عورتوں کو تعلیم دیا کرتی تھیں۔

مکہ مکرمہ کے قاضی شیخ شہاب الدین طبری کی صاحبزادی ام الحسین محدثہ و فقیہہ اور عابدہ و زاہدہ عورت تھیں، انھوں نے مکہ مکرمہ میں بہت سے رفاہ عام کے کام کئے

[1] بغیۃ الملتمس ص ۵۳۱ [2] رر ص ۵۲۸۔

جن میں مدرسۃ الایتام بھی تھا، اس مدرسہ کو تعمیر کر کے بہت سی جائداد وقف کی تاکہ یتیم بچوں کی تعلیم و تربیت ہو سکے، امام فاسی نے لکھا ہے۔

ولھا ... وکتاب ایتام	ام الحسین نے یتیموں کا مدرسہ
ووقفت علی ذالک وقفاً	بنوایا جس پر کافی جائداد مکہ مکرمہ
کافیاً بمکۃ وفی بعض	اور اس کے باہر وقف کی تھی،
اعمالھا۔[1]	

سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی بہن شہزادی ربیعہ خاتون نے جو عالمہ فاضلہ تھیں، شام کے مقام جبل میں ایک عظیم الشان مدرسہ تعمیر کیا تھا، جس میں بڑے بڑے اساتذہ و شیوخ تعلیم دیتے تھے، اسی مدرسہ کے صحن میں ربیعہ خاتون دفن کی گئیں[2]۔ اسی طرح مقام جبل میں سلطان اتابک زنگی کی پوتی شہزادی ترکان بنت سلطان مسعود نے مدرسہ بنوایا اور مرنے کے بعد اسی میں دفن کی گئیں، امام ذہبی نے اسی مدرسہ کی نسبت سے ان کا تذکرہ صاحبۃ المدرسۃ والتربۃ بالجبل کے الفاظ سے کیا ہے،

بعض خواتین کے ایصال ثواب کے لیے مدرسے تعمیر کئے گئے جن میں مدتوں اسلامی علوم کی تعلیم جاری رہی اور خواتین کی ذات ان کا سبب بنی، دمشق میں ایک مشہور خاتون ام صالح ملک خاتون تھیں، ان کے ایصال ثواب کے لئے ان کی تربت کے پاس ایک عظیم الشان مدرسہ جاری کیا گیا، جس میں تجوید قرات کی تعلیم دی جاتی تھی، اور اس فن کے ائمہ مدرس تھے، امام سخاوی کے مشہور شاگرد شیخ جمال الدین ابراہیم ابن داؤد مقری عسقلانی اس میں شیخ القراۃ تھے، ان کے بعد شیخ زین الدین لوذی مقری

[1] العقد الثمین ج ۸ ص ۲۴۲ [2] العبر ج ۵ ص ۱۶۷ [3] رر ص ۱۶۵

بائیس[۲] سال تک مدرسہ ام الصالح میں شیخ المقرئین رہے، اور قراء کی بہت بڑی جماعت نے ان سے تعلیم حاصل کی، نیز اس مدرسہ میں شیخ ناصر الدین محمد شافعی دمشقی نے مدتوں درس دیا۔[۱]

مکہ مکرمہ کے مدرسہ قائتبائی کے قیام و اجراء میں ایک نیک دل خاتون کے اخلاص و ایثار کو بڑا دخل تھا، اور یہ شاہی مدرسہ ایک فقیر کے جذبۂ ایثار کی نشانی بنا، ۸۸۳ھ میں سلطان قائتبائی نے مکہ مکرمہ کے شاہی وکیل کو لکھا کہ اس کے نام سے ایک مدرسہ جاری کیا جائے جس میں مذاہب اربعہ کی تعلیم دیجائے، اسی کے ساتھ ایک رباط بنائی جائے جس میں یتیموں کے قیام کے لیے بہتر[۲] کمرے بنوائے جائیں، مدرسہ کے طلبہ کو بقدر کفایت وظیفہ بھی دیا جائے، وکیل نے اس مدرسہ کے لیے جگہ تلاش کی تو بنی حسن کی نیک دل خاتون شریفہ شمسیہ نے اپنا ذاتی مکان پیش کر دیا۔ جسے خرید کر مدرسہ قائتبائی تعمیر کیا گیا، یہ مدرسہ باب السلام اور باب النبی کے درمیان میں واقع تھا، اور مدتوں اس کا فیض جاری رہا۔[۲] سلطان مراد خان ترکی کی والدہ مرحومہ نے شہر اسکدار میں ایک عظیم الشان مدرسہ تعمیر کرایا تھا، جس میں شیخ احمد بن روح اللہ انصاری نے درس دیا، اور ملک روم کے علماء و فضلاء اور اعیان وہی مدرسہ میں آکر ان کے درس میں شریک ہوئے (الطبقات السنیہ فی تراجم الحنفیہ ص ۵۰۴) مدرسہ عذراویہ اور مدرسہ خاتونیہ برانیہ دمشق کے مشہور مدرسے تھے، جن کی تعمیر خواتین نے کی تھی، اور ان میں علماء نے درس دیا، اسی طرح زبید یمن میں مدرسہ ام السلطان المجاہد تھا، جس کے مدرس شیخ ابو اسحٰق ابراہیم بن عمر علوی متوفی ۵۲ھ تھے۔ (ایضاً ص ۴۳۲، ۴۴۷ و ۴۵)

---

[۱] النہج ص ۳۰۵ [۲] تاریخ مکہ احمد سباعی ص ۲۲۰

خواتینِ اسلام نے مدارس کی طرح بہت سی رباطین یعنی سرائیں اور خانقاہیں بھی تعمیر کیں جن میں عابدات و زاہدات اور صوفیات سکون و اطمینان سے زہد و تقویٰ اور احسان و تصوف کی زندگی بسر کرتی تھیں، زہرہ بنت محمد نہایت صالحہ اور صوفیہ تھیں، انھوں نے دمشق میں اپنے نام سے رباط الزہرہ بنائی اور اسی کے قریب سکونت اختیار کر کے اپنی خانقاہ کی عابدات و صوفیات کو فیض پہونچایا۔ فاطمہ بنت حسین رازیہ عابدہ زاہدہ اور واعظہ تھیں، انھوں نے عابدات و زاہدات اور صوفیات کے لیے رباط بنوائی تھی۔

مکہ مکرمہ میں خواتین نے بہت سی رباطین اور خانقاہیں تعمیر کرائی تھیں جن میں عابدات و زاہدات کے لیے ہر طرح کا انتظام تھا، امام تقی الدین فاسی مکی کی شفاء الغرام سے چند خانقاہوں کی نشاندہی کی جاتی ہے، خلیفہ مقتدی عباسی کی قہرمانہ نے ۴۹۲ھ میں رباط فقاعیہ تعمیر کرائی تھی، جو ایسی بیواؤں کے لیے وقف تھی، جن کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا تھا، خلیفہ ناصر عباسی کی والدہ کے نام سے رباط ام الخلیفہ تھی، جس کی تاریخ وقف ۵۷۹ھ تھی، شریفہ فاطمہ بنت امیر ابو یعلیٰ محمد نے ۶۰۷ھ میں رباط خاتون بنوا کر وقف کیا، ام الحسین بنت شہاب الدین طبری مکیہ نے رباط السدرہ کرا کے فقراء و مساکین کیلئے وقف کیا، شیخ قطب الدین قسطلانی کی والدہ اور مکہ مکرمہ کی دیگر خواتین نے مل کر رباط المنا کے نام سے ایک رباط تعمیر کی جس میں بے سہارا اور بے وطن دیندار عورتیں رہتی تھیں، رباط بنت التاج ان خواتین کے لیے وقف تھی، جو اپنے وطن سے مکہ مکرمہ آکر عبادت و ریاضت میں مشغول رہتی تھیں، ابو ثامر مبارک بن عبد اللہ قاسمی کی دو صاحبزادیوں (ام خلیل خدیجہ اور ام عیسیٰ مریم) نے رباط ابن السوداء خرید کر ان شافعی المذہب عابدات و صوفیات کے لیے وقف کی جن کے شوہر نہیں تھے، ام سلیمان اور بنت الحرابی

دو خواتین نے مکہ زاویہ ام سلیمان اور رباط بنت الحرابی کے نام سے دو خانقاہیں تعمیر کیں جن میں مکہ مکرمہ کی عابدات قیام کرتی تھیں، یمن الملک الاشرف اسمٰعیل بن فضل کی زوجہ آدر الکریہ نے رباط الجہۃ تعمیر کر کے وقف کی۔[1]

واضح ہو کہ ان رباطوں اور خانقاہوں میں علوم اسلامیہ کی وہ طالبات بھی رہتی تھیں جو خواتین اساتذہ سے تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ علما و طلبہ کے لیے بھی انھوں نے اس طرح کی خدمت انجام دی ہے . . . . خلیفہ مستضی عباس کی باندی طالب الزمان حبشیہ نے مکہ مکرمہ میں رفاہ عام اور خیرات کے جو بہت سے کام کئے، ان میں نمایاں کام یہ تھا کہ ۵۰۰ھ میں دار زبیدہ کو خرید کر دس عدد شافعی علما و فقہاء کے قیام کے لئے وقف کر دیا دار زبیدہ وہی دار ارقم ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کفار مکہ کے ظلم و ستم سے عاجز ہو کر روپوش ہو گئے تھے، اور اسی میں قرآن پڑھتے پڑھاتے تھے، معلوم ہو چکا ہے کہ یتیم بچوں کے لیے ام الحسین نے ایک مدرسہ قائم کر کے اس پر کافی جائداد وقف کی تھی،

خواتین اسلام کی رفاہی خدمات کے سلسلے میں یہ معلومات عبرت انگیز ہیں کہ ام الحسین نے مسعیٰ میں پانی کی ایک سبیل وقف کی تھی، صوفیہ ام سلیمان کی ایک سبیل ان کی قبر کے قریب جنت المعلیٰ سے متصل تھی، مصر کے بادشاہ الملک الناصر کی بہن نے سبیل الست بنوا کر وقف کی تھی، زینب بنت قاضی شہاب الدین نے اپنے بھائی قاضی نجم الدین کی طرف سے سبیل السیدہ کو صدقہ کیا تھا، خلیفہ مقتدر عباسی اور اس کی والدہ دونوں نے مکہ سبیل جوخی" تعمیر کر کے وقف کی، صوفیہ ام سلیمان نے محلہ سوق اللیل میں عورتوں کے لئے ایک طہارت خانہ بنوایا تھا۔[2]

بنفشہ متوفی ۵۹۸ھ ہجری کا لقب جہتہ معظمہ تھا، بڑی عالمہ فاضلہ اور

[1] شفاء الغرام جلد اول [2] ایضاً

نیک دل خاتون تھیں، انھوں نے سوق المدرسہ نامی علاقہ میں صوفیات و عابدات کے لئے ایک رباط اور خانقاہ بنوائی جس کا افتتاح پہلی رجب کو کیا، اس افتتاحی تقریب میں بنفشہ نے بہت بڑی دعوت کا انتظام کیا، جس میں عابدات و صوفیات نے شرکت کی اور موقع کی مناسبت سے وعظ و تقریر کا سلسلہ بھی رہا، ایک کمرہ رباط زوزنی کے شیخ و مرشد ابوبکر صوفی کی بہن کے لیے مخصوص کیا گیا، اور جہتہ معظمہ بنفشہ نے شرکائے جلسہ میں مال تقسیم کیا۔[1]

سلطان مراد خان کی والدہ مرحومہ نے جو مدرسہ تعمیر کرایا تھا، اس کے افتتاح کی تقریب بھی جہتہ معظمہ بنفشہ کی خانقاہ کی افتتاحی تقریب سے کچھ کم نہ تھی، شیخ احمد بن روح جابری انقانی حنفی نے اس میں پہلا درس یوں دیا کہ اس زمانہ کے رواج کے برخلاف درس کی عام مجلس منعقد کی، جس میں دیار روم کے علماء و فضلاء کی ایک بڑی جماعت شریک ہوئی، شیخ احمد نے سورہ انعام کی ایک آیت کی تفسیر بیان کی، اس موقع پر نہایت شاندار علمی اور دینی جشن منایا گیا، سلطان کی والدہ نے تمام شرکائے درس کی دعوت کے لیے ایک ہزار دینار کا عطیہ دیا، اور انواع و اقسام کے عمدہ عمدہ کھانوں سے حاضرین کی تواضع کی گئی، پھر ان ہی شرکاء درس میں سے تقریباً پچاس ۵۰ اہل علم کو مدرسۂ مذکورہ میں ملازم رکھا گیا۔[2]

ذاتی اوصاف و کمالات | یہ عالمات، محدثات، فقیہات، مفتیات، صوفیات اور معلمات علم و فضل، ورع و کردار کی دولت کے ساتھ جاہ و حشم، شان و شوکت، عفت و عصمت، عزم و حوصلہ، فہم و فراست، نظم و ضبط کے ذاتی اوصاف و کمالات بھی رکھتی تھیں۔

ام خلیل شجرۃ الدر حسن و جمال کے ساتھ ذکاوت، عقلمندی، اور بہادری میں بھی مشہور تھیں، خدیجہ بنت شہاب الدین نویریہ مکیہ کے بارے میں تصریح ہے کہ یہ خاتون

[1] المنتظم ج ۱۰ ص ۱۷۱ [2] الطبقات السنیہ فی تراجم الحنفیہ ج ۱ ص ۴۰۶

دینداری، پرہیزگاری، عفت، شرافت وکرامت اور عبادت میں بہت اونچا مقام رکھتی تھیں۔[1]

مکہ مکرمہ کے قاضی وخطیب کی صاحبزادی محدثہ زینب ہاشمیہ عزت وشرافت، اخلاق ومروت، بلند ہمتی اور عقل ودانش میں یکتا تھیں۔[2] قاضی مکہ شیخ نجم الدین احمد کی صاحبزادی کمالیہ کی اولوالعزمی اور عالی حوصلگی کا اندازہ ان کے شوہر شیخ خلیل مالکی کے اس قول سے ہوسکتا ہے۔

لو انها حاولت جبلاً لازالته[3]	اگر وہ پہاڑ کو اپنی جگہ ہٹانا چاہتیں تو ہٹا دیتیں۔

تقوی طہارت میں عزیمت کی مثال اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتی ہے کہ دسویں صدی کی ایک عابدہ زاہدہ سیدہ بدیعہ ایجیبیہ مکہ مکرمہ میں رہتی تھیں اور تیس سال سے زائد مدت تک اس گوشت اور میوے وغیرہ کو منہ میں نہیں ڈالا جو افریقہ کے مقام بجیلہ سے منگائے جاتے تھے، کیونکہ وہاں کے باشندوں کے بارے میں سیدہ بدیعہ کو بتایا گیا تھا کہ وہ لڑکیوں کو وراثت میں شریک نہیں کرتے ہیں، اس بارے میں وہ اپنے والد شیخ نورالدین کے نقش قدم پر چلتی تھیں، جو مدینہ منورہ کے پھلوں کو اس لئے استعمال نہیں کرتے تھے کہ ان کے علم میں وہ لوگ ان کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتے تھے۔[4]

خواتین اسلام کے غایت زہد وتقویٰ کی یہ مثال بھی سبق آموز ہے کہ ایک مرتبہ حضرت بشر حافی بغدادی کی بہن نے امام احمد بن حنبل سے فتویٰ پوچھا کہ ہم لوگ رات کو اپنی چھت پر سوت کاتتی ہیں، اس اثناء میں پولیس والوں کی مشعلیں ہمارے

[1] العقد الثمین ج ۸ ص ۲۰۸ [2] ،، ص ۲۳۳ [3] ،، ایضاً ص ۳۱۲ [4] حاشیہ رسالۃ المسترشدین محاسبی ص ۳۴۔

قریب سے گذرتی ہیں، اور ان کی روشنی ہم لوگوں تک پہونچتی ہے تو کیا ان کی روشنی میں ہماری کتائی جائز ہے؟ امام احمد نے جواب دینے کے بجائے ان سے سوال کیا کہ تم کون ہو؟ اور جب انھوں نے بتایا کہ میں بشر حافی کی بہن ہوں تو امام صاحب نے روتے ہوئے فرمایا

من بیتکم یخرج الورع الصادق لا تغزلی فی شعاعها۔	تم ہی لوگوں کے گھر سے سچی پرہیزگاری کا ظہور ہوتا ہے، تم اس روشنی میں سوت نہ کاتو۔

فاطمہ بنت نصر بن عطار نہایت عابدہ زاہدہ عالمہ تھیں، ان کے حجاب کا یہ حال تھا

ماخرجت فی عمرها من بیتها الا ثلاث مرات لضرورة، وکانت لا تلتفت الی زینة الدنیا۔[1]	زندگی میں صرف تین بار ضرورت کی وجہ سے گھر سے باہر نکلیں، دنیا کی زیب زینت سے سروکار نہیں رکھتی تھیں۔

اسی طرح ام عبدالرحمٰن صفیہ بنت ابوالخیر مخزومیہ کے بارے میں تصریح ہے کہ

لا تخرج من بیتها الا للحج والتحلل منها[2]	وہ صرف حج کے مناسک کی ادائگی کے لئے گھر سے نکلتی تھیں۔

ام کلثوم بنت قاضی جمال الدین قرشیہ مکیہ شادی کے بعد اپنے شوہر قاضی شہاب الدین احمد بن ظہیرہ کے ساتھ رہیں مگر ایک سال تک کسی دوسرے نے ان کا چہرہ نہیں دیکھا وہ تادم مرگ یوں رہیں کہ ان کی مانگ تو کیا ان کے سر کا بال بھی نہ دیکھا جاسکا، انکا حال یہ تھا کہ اگر اپنی کسی لڑکی کو کھلے سر دیکھتی تھیں تو سزا دیتی تھیں۔

[1] المنتظم ج ۱۰ ص ۲۴۹ [2] العقد الثمین ج ۸ ص ۲۶۱

وکانت خیرۃً عاقلۃً ذات عفۃ وصیانۃ۔[1] — وہ بڑی نیک عقلمند اور عفت و عصمت والی خاتون تھیں،

ست الکل بنت ابراہیم جیلانیہ کی والدہ عائشہ خاتون بڑی بااخلاق اور بامروت عالمہ فاضلہ تھیں، ان کا مستقل قیام عدن میں تھا، اور تجارتی سلسلہ میں مکہ مکرمہ آتی جاتی تھیں حتی کہ اسی دوران میں مکہ مکرمہ میں فوت ہوئیں، مگر کبھی حجاب سے باہر نہیں ہوئیں، اور نہ کسی اجنبی نے ان کا چہرہ دیکھا۔[2]

ان بنات اسلام میں سے کئی ایک نے اپنی پوری زندگی علم اور دین کے لیے یوں وقف کردی کہ زندگی بھر شادی نہیں کی مردوں میں ایسی مثالیں بہت کم ملے گی کہ علمی اور دینی زندگی کی خاطر تجرد اختیار کیا گیا ہو، اور پوری زندگی شادی نہ کی گئی ہو، مگر خواتین میں اس کی متعدد مثالیں ہیں۔

ام الکرام کریمہ بنت احمد مروزیہ مستقل طور سے مکہ مکرمہ میں رہتی تھیں، ائمہ حدیث نے ان سے صحیح بخاری کی روایت کی ہے، انھوں نے زندگی بھر شادی نہیں کی اور بحالت تجرد بڑی عمر میں وفات پائی ہے۔[3]

فاطمہ بنت سلیمان معمرہ محدثات میں سے ہیں تقریباً نوے سال کی عمر میں فوت ہوئیں مگر زندگی بھر تنہا رہیں، اور شادی نہیں کی، شیخہ معمرہ حبیبہ بنت عزالدین مقدسیہ اکانوے سال کی عمر میں فوت ہوئیں، انھوں نے بھی شادی نہیں کی تھی۔[4]

مسندۂ شام زینب بنت کمال الدین نے بھی پوری زندگی علم و عمل اور صلاح

---

[1] العقد الثمین ج ۸ ص ۳۵۲ [2] ر ر ص ۲۷۳ [3] العبر ج ۳ ص ۲۵۴ [4] العقد الثمین ج ۸ ص ۲۱۶
[5] ذیل العبر ذہبی ص ۴۳ [6] ذیل العبر حسینی ص ۲۴۰

وتقوی میں بسر کی اور دنیا سے بن بیاہی گئیں۔[1]

اعتراف واحترام

ان عالمات وفاضلات کی خدمت وعظمت کے اعتراف میں علمائے اسلام نے بڑی فراخ دلی اور وسعت ظرفی کا ثبوت دیا ہے، ان کو بڑے بڑے القاب وخطابات سے نوازا، ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا، ان سے استفادہ وافادہ میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، ام محمد خدیجہ بغدادیہ امام احمد بن حنبل کی مجلس میں حاضر ہوا کرتی تھیں، امام صاحب ان سے بہت مانوس تھے اور ان پر خاصی توجہ فرماتے تھے، امام صاحب کے صاحبزادے کا بیان ہے،

کانت تجیئ الی ابی تسمع منہ ویحدثہا۔[2] — خدیجہ والد صاحب کے پاس آتی جاتی تھیں اور ان سے حدیث کا سماع کرتی تھیں اور والد صاحب بھی ان سے احادیث بیان کیا کرتے تھے۔

مشہور حافظ حدیث ابن علیہ کی والدہ عُلَیۃ بنت حسان کے پاس بصرہ کے مشائخ اور فقہاء آتے تھے اور وہ ان سے علمی اور دینی گفتگو کرتی تھیں، مشہور محدثہ اور عابدہ زاہدہ ریطہ بنت عبد اللہ کی زیارت کے لیے بڑے بڑے مشائخ اور عباد وزہاد آیا کرتے تھے ابن جوزی نے لکھا ہے۔

وکان مشائخ الزہاد یزورونہا۔[3] — ریطہ کی زیارت بڑے بڑے زاہد اور مشائخ کیا کرتے تھے۔

خدیجہ بنت شہاب الدین مکیہ سے اہل علم کے استفادہ کا یہ حال تھا، کہ ان میں اور

---

[1] ذیل العبر ذہبی ص ۲۱۳ [2] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۴۳۶ [3] المنتظم ج ۶ ص ۲۵۰

رہا کرتی تھی۔[1]

ان کے معاصر علماء میں مختلف علمی اور دینی مسائل میں خط و کتابت خواتین اسلام کی عظمت و جلالت از امامت و دیانت کا علمی اقرار و اعتراف ان کے ہاتھ سے خرقہ پوشی کے ذریعہ بھی ہوا ہے، اور مشائخ نے شیخات سے احسان و تصوف میں خرقہ حاصل کیا ہے، امۃ الرحمن فاطمہ بنت قطب الدین مکیہ جمالیہ نے شیخ نجم الدین تبریزی سے خرقۂ خلافت پہنا، اور اعیان کی ایک جماعت کو حدیث کی تعلیم دیکر خرقۂ خلافت پہنایا،[2]

حفصہ بنت سیرین کی بزرگی و برتری کا اعتراف ایاس بن معاویہ نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

ما ادرکت احداً افضلہ	میں نے کسی کو ایسا بزرگ نہیں پایا
علی حفصۃ۔[3]	کہ اسے حفصہ پر فضیلت دوں،

شیخہ ام الفتح امۃ السلام بنت قاضی ابوبکر احمد بن کامل بغدادیہ کے علم و فضل اور دین و دیانت کا اعتراف بغداد کے اعیان محدثین کیا ہے، خطیب کا بیان ہے۔

سمعت الازھری والتنوخی	میں نے امام ازہری اور امام تنوخی کو
ذاکر امۃ السلام بنت	امۃ السلام کا تذکرہ کرتے ہوئے سنا ہے،
احمد بن کامل فاثنیا علیھا	ان دونوں حضرات نے ان کی خوب تعریف
ثناءً حسناً، ووصفاھا	کی اور ان کی دیانت، عقل اور فضل
بالدیانۃ والعقل والفضل[4]	کو بیان کیا،

امام ابوحامد اسفرائینی اپنی جلالتِ شان کے باوجود ام حسین جمعہ بنت احمد نیساپوریہ کی تعظیم و تکریم کیا کرتے تھے، محدث خلال کا بیان ہے،

---

[1] العقد الثمین ج ۸ ص ۲۰۸، [2] ،، ص ۲۸۸ [3] تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۴۰۹۔

[4] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۴۳۴، [5] ،، ص ۴۴۴۔

کان ابوحامد الاسفرائینی	ابوحامد اسفرائینی ان کی تعظیم و تکریم
یعظمھا ویکرمھا۔[1]	کرتے تھے۔

ام زینب فاطمہ بنت عباس بغدادیہ محدثہ واعظہ تھیں اور عوام و خواص میں بے پناہ مقبولیت رکھتی تھیں ذہبی کا بیان ہے،

وکان لھا قبول زائد	ان کی ہر دل عزیزی اور لوگوں میں
ووقع فی النفوس۔[2]	مقبولیت حد سے زائد تھی۔

خدیجہ بنت شہاب الدین نوریہ مکیہ کے بھائی شیخ الاسلام قاضی کمال الدین اور قاضی نور الدین اپنی بہن کا حد درجہ احترام کرتے اور ان سے دعا کراتے تھے، فاسی کا بیان ہے،

یبالغان فی اکرامھا غایۃ	دونوں بھائی اپنی بہن کی تعظیم و تکریم
المبالغۃ ویتبرکان بدعائھا	میں انتہائی درجہ مبالغہ سے کام لیتے تھے،
	اور ان کی دعا کی برکت حاصل کرتے تھے۔[3]

فخر النساء، شہدہ بنت احمد بغدادیہ کے علم و فضل کا شہرہ دور دور تک تھا،[4] ان خادماتِ اسلام کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی کا آخری منظر اس وقت قابل دید ہوتا تھا۔ جب وہ دنیا سے جاتی تھیں، اور علماء اور عوام والہانہ انداز سے ان کو الوداع کہتے تھے، اور ان خواتین کے جنازے میں بے پناہ مخلوق شریک ہوتی تھی، بغداد کی مشہور محدثہ اور زاہدہ فاطمہ بنت نصر کے جنازہ میں اس قدر زیادہ مسلمان شریک ہوئے کہ لوگوں کی بھیڑ کی وجہ سے جامع القصر کے مقصورہ کی جالیاں نکالنی پڑیں، اطراف

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۴۴۴ [2] ذیل العبر ذہبی ص ۸۰ [3] العقد الثمین ج ۸ ص ۲۰۰ [4] ابن خلکان ج ۱ ص ۲۴۵

تمام بازار اور سڑکیں آدمیوں سے بھر گئیں، اور عید کے دن سے زیادہ مجمع ہوا، ان کے جنازہ میں علماء اور عوام کے علاوہ ارکان دولت بھی شریک ہوئے، اعیان بغداد مقبرۂ امام احمد تک ان کے جنازہ کے ساتھ گئے، بھائی نے نماز جنازہ پڑھائی، اور باپ کے پہلو میں دفن کی گئیں، مدتوں ان کا ذکر خیر عوام و خواص میں ہوتا رہا۔[1]

اندلس کی محدثہ و فقیہہ اور عابدہ و زاہدہ فاطمہ بنت یحییٰ قرطبہ میں فوت ہوئیں اور مقام ربض میں دفن کی گئیں۔۔۔ ان کے جنازہ کے بارے میں لکھا ہے کہ اس میں اس قدر آدمی شریک ہوئے کہ کسی عورت کے جنازہ میں اس سے زیادہ آدمی نہیں دیکھے گئے، ان کی نماز جنازہ محمد بن ابو زید نے پڑھائی تھی،[2]

فخر النساء شہدہ بغدادیہ کی نماز جنازہ جامع القصر میں ادا کی گئی، اور اس قدر مجمع ہوا کہ مقصورہ کی جالیاں ہٹانی پڑیں، ابن جوزی کا بیان ہے کہ ان کے جنازہ میں علماء اور کثیر مخلوق نے شرکت کی، اسی طرح مکہ مکرمہ کی محدثہ ام الخیر جویریہ کے جنازہ میں خلق کثیر نے حاضری دی اور ام زینب فاطمہ بنت عباس بغدادیہ کا جنازہ بھی، جنازۂ مشہودہ تھا، اور ایک جم غفیر نے اس میں شرکت کی،

---

[1] المنتظم ج ۱۰ ص ص ۹، ۲ [2] بغیۃ الملتمس ص ۵۳۱،

پاکستان میں چار مہینے

از

سید صباح الدین عبدالرحمن

یہ خاکسار پاکستان میں چار مہینے قیام کے بعد ۵/ دسمبر ۷۵ء کو اعظم گڈھ واپس آیا، میری لڑکی کی نسبت میرے خاندان ہی کے ایک قریبی عزیز ڈاکٹر راشد مصطفیٰ ام۔بی۔بی۔ایس سے طے تھی، وہ پہلے مشرقی پاکستان (اب بنگلہ دیش) میں چاٹگام کے میڈیکل کالج میں پڑھتے تھے، وہاں کے ہنگامہ کے بعد ملتان میڈیکل کالج بھیج دیئے گئے، یہاں سے پاس ہو کر کراچی میں تھے، پاکستان سے آمد و رفت کا راستہ بند تھا، اس لئے شادی میں تاخیر ہوتی چلی جا رہی تھی جناب فخر الدین علی احمد صاحب جب حکومت ہند کے وزیر زراعت اور غذا تھے تو ان کی خدمت میں ایک عریضہ روانہ کیا کہ اگر لڑکی کی شادی کے لئے خصوصی اجازت مل سکتی ہو، اور میرے پاکستان جانے میں حکومت کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں اس اجازت کے لئے درخواست دوں، ان کو دار المصنفین سے بڑا تعلق ہے، جناب ڈاکٹر ذاکر حسین کی رحلت کے بعد اس ادارہ کی رکنیت قبول فرما کر اس کی عزت بڑھائی ہے، انھوں نے اپنی غیر معمولی عنایت سے یہ لکھکر فرمایا کہ میں اس اجازت کے لئے باضابطہ پاسپورٹ کی درخواست دوں، اگر اس کے ملنے میں کوئی دقت ہو تو میں ان کو اطلاع دوں، اس سے امید بندھی، اس کے بعد میں اعظم گڈھ کے کلکٹر شری بی کے چترویدی صاحب اور سپرنٹنڈنٹ پولیس شری ٹی ان مصرا سے ملا، انھوں نے میری لڑکی کی شادی سے دلچسپی دکھائی، اور میرے اور میرے اہل و عیال کے پاسپورٹ کی درخواستوں کو اپنی سفارش کے ساتھ لکھنؤ بھیج دیا، وہاں کی کارروائی

میں دیر ہوئی تو میں، اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ شریمتی ہیم وتی نندن بہوگنا سے ملا، انھوں نے پوری ہمدردی
کا اظہار کیا، یہ اجازت صوبے کے بجائے مرکز سے مل سکتی تھی، اس لئے انھوں نے دہلی سفارش
کی، پھر بھی اجازت ملنے میں تاخیر ہوئی، اس وقت تک جناب فخرالدین علی احمد صاحب حکومت
ہند کے راشٹرپتی کے عہدے پر فائز ہو چکے تھے، ان کی محبت سے فائدہ اٹھا کر ان کی توجہ دلائی
کہ لکھنؤ سے میری اور میرے خاندان کی درخواستیں محکمہ امور خارجہ میں بھیج دی گئی ہیں، وہاں سے
اجازت نہیں ملی ہے، انھوں نے پھر اپنی عنایت سے سرفراز کیا، اور میرا خط امور خارجہ کے
دفتر میں بھیج دیا، وہاں سے لکھنؤ کے انٹرنیشنل پاسپورٹ آفس میں ٹیلیفون آیا کہ میرے اور میرے
خاندان کو پاسپورٹ جاری کردیئے جائیں، میں لکھنؤ پہنچا، تو پاسپورٹ افسر جناب اے ال پوری
صاحب نے بہت ہی اخلاق سے پیش آکر بتایا کہ اب خصوصی اجازت کی ضرورت نہیں، انٹرنیشنل
پاسپورٹ جاری کرکے اس میں پاکستان جانے کی اجازت دیدی جاتی ہے، مجھ کو انٹرنیشنل
پاسپورٹ لینے کی ہدایت دی، اب پھر از سر نو فارم بھرے، اور چھ آدمیوں کے پاسپورٹ کی
فیس ادا کرنے کے بعد یہ حاصل ہوگئے، خوش تھا کہ مراد برآئی، اب ویزا حاصل کرنے کی فکر ہوئی،
سوئٹزرلینڈ کا سفارت خانہ پاکستان کی نیابت کرتا ہے، اس کے پاس فی آدمی کے لئے چار فارم
بھر کر درخواستیں بھیجیں، میری یہ درخواستیں اسلام آباد بھیجی گئیں، وہاں سے ویزا جاری کرنے کی اجازت
کافی دیر میں آئی، اجازت کی اطلاع آنے پر سوئٹزرلینڈ کے سفارت خانہ کی طرف سے پاسپورٹ
طلب کئے گئے، میں نے رجسٹری سے چھ پاسپورٹ دہلی بھیجے، مگر میری پریشانی کی کوئی حد
نہیں رہی جب ڈاک گھر سے یہ اطلاع ملی کہ یہ رجسٹری ڈاک گھر سے گم ہوگئی، اور اس کا کہیں
پتہ نہیں چل رہا ہے، یہ اطلاع اس وقت آئی جب ہم لوگ سامان باندھ سفر کے لئے تیار تھے،
اعظم گڈھ کے ڈاکخانہ کے سپرنٹنڈنٹ نے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا، اور ان کا ایک

سرٹیفکیٹ لے کر لکھنؤ پاسپورٹ آفس پھر پہنچا، پوری صاحب نے بھی بڑا ہمدردانہ برتاؤ کیا، اور پھر سے
سب کی طرف سے درخواستیں دینے کو کہا، درخواستوں کے ساتھ پھر فیس ادا کی، تو پاسپورٹ ملے
اس کے بعد خود دہلی جاکر ویزا حاصل کئے،

یہ جوئے شیر نکال کر پاکستان کے لئے اہل وعیال کے ساتھ، ۷ اگست ۱۹۷۵ء کو اعظم گڈھ سے
روانہ ہوا، ۹ اگست کو اتر پردیش کی اردو اکاڈمی کا ایک جلسہ تھا، اس میں بھی شرکت کی،

اردو اکاڈمی کے جلسہ میں شرکت

اس کے جلسہ میں پہلی دفعہ شریک ہوا، بیگم حامدہ حبیب اللہ اس کی صدر
ہیں، اس لئے انھوں نے جلسہ کی صدارت کی، جس کی کاروائی میں اپنے
پورے وزن اور وقار کو ملحوظ رکھا، اس جلسہ میں پارلیمانی اور جمہوری رنگ نظر آیا، طرح طرح کے
معترضانہ سوالات ہوئے، بحثیں بھی ہوئیں، لیکن بیگم صاحبہ اور اس کے سکریٹری جناب
صباح الدین عمر صاحب نے تمام اراکین کو ہر طرح سے مطمئن کرنے کی کوشش کی، اس کے اراکین کو اپنے
حقوق کو استعمال ضرور کرنا چاہئے، مگر ان کے استعمال کے وقت یہ خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ
اس اکاڈمی کو مفید مشورے دے کر اس کے ذریعہ سے اردو کے لئے زیادہ سے زیادہ تعمیری کام بھی
انجام ہوتا رہے، اس کا جلسہ صرف بحث و مباحثہ کا اکھاڑا نہ ہو، آخر میں اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ
جناب ہیم وتی نندن بہوگنا نے بھی اس جلسہ میں شرکت کرکے اس کو مخاطب کیا، اردو سے متعلق ان کی تقریر
بہت ہی حوصلہ افزا تھی، اور وہ لکھنؤ ہی کی اردو میں اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے، انھوں نے
اعلان کیا کہ آئندہ یو۔پی کا گزٹ، اردو میں بھی حکومت کی طرف سے بالالتزام شائع ہوگا، اور
وہ اسکولوں کے آٹھویں درجہ تک اردو تمام طلبہ کے لئے لازمی قرار دینے کا ارادہ رکھتے ہیں،
اور جو افسر اردو نہیں جانتے ہیں، وہ اگر اردو کا امتحان پاس ہوگئے، تو ان کو انعامات دیئے
جائیں گے، آخر میں یہ بھی کہا کہ اگر اردو اس ریاست میں پنپ گئی، تو پورے ملک میں باقی رہے گی،

ان تقریبوں سے حاضرین کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں، اور خراج تحسین میں تالیاں بجائی جا رہی تھیں، شام کو انھوں نے اپنے گھر پر ایک پرتکلف عصرانہ دیا جس میں وہ تمام مہمانوں سے بڑی بے تکلفی اور خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتے رہے، ان سطروں کے لکھتے وقت ریڈیو سے یہ معلوم ہوا کہ وہ وزارت اعلیٰ کے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔

سفر کا آغاز ۹ اگست کو ہم لوگ امرتسر ایکسپریس سے چار بجے سہ پہر کو لکھنؤ سے روانہ ہوئے، ۱۰ اگست کی صبح کو امرتسر پہونچے، قلیوں نے توقع کے خلاف اپنی اجرت اپنی مقررہ شرح سے دس گنی رقم زیادہ وصول کی، مگر اخلاق سے پیش آئے، ہم لوگ امرتسر سے اٹاری کے لیے ایک ٹیکسی میں روانہ ہوئے، فاصلہ انیس ۱۹ میل کا ہوگا، لیکن ٹیکسی کا کرایہ ۳۰ روپے ادا کرنا پڑا، ڈرائیور ایک سردار جی تھے، راستہ میں پوری ہمدردی کے ساتھ باتیں کرتے رہے، اٹاری پہونچے تو سامان کی دیکھ بھال شروع ہوئی، سرکاری ملازمین زیادہ نرسکھ تھے، خیال تھا کہ معلوم نہیں کیا کیا اعتراضات ہوں گے مگر الحمد للہ کوئی چیز ایسی نہیں نکلی جس پر کسٹم والوں کے اعتراضات ہوتے، قلیوں نے یہاں بھی کافی اجرت وصول کی، اپنے ملک کی سرحد پار کرکے پاکستان پہونچے تو وہاں بہت سے اعزہ دو موٹریں لیے منتظر تھے، میرے دوست مولوی عزیز الرحمن کے لڑکے عتیق الرحمن فاروقی بھی جو پاکستان میں کسٹم انسپکٹر ہیں وہاں موجود تھے، انھوں نے ہر طرح کی خاطر تواضع کی اور لاہور میں اپنے ایک عزیز عزیز الحق کے یہاں رات بھر قیام کیا، وہ مسلم کمرشیل بینک میں منیجر ہیں، انھوں نے پہلے ہی سے ٹکٹ خرید لیے تھے، اس لئے دوسرے دن علی الصباح میرے پھوپھی زاد بھائی کمال احمد نے اپنی گاڑی پر لاہور اسٹیشن پہونچا دیا، وہ پاکستان کی ایک دوا ساز کمپنی کے ایک افسر ہیں، لاہور سے ہم لوگ سوہنی ایکسپریس نامی ایک ریل گاڑی میں کراچی پہونچے، بڑی تیز رفتار گاڑی ہے، اور گاڑیاں ۲۲ گھنٹے میں کراچی پہنچتی ہیں مگر یہ سولہ ۱۶ گھنٹے میں پہونچ جاتی ہے، بہت کم اسٹیشنوں پر ٹھہرتی ہے،

مگر مسلسل سولہ گھنٹے بیٹھنے سے بڑی تکان محسوس ہوئی، راستے میں ریت اور گرد سے بھی سابقہ رہا، رات کو تقریباً دس بجے کراچی پہونچے، بکثرت اعزہ اسٹیشن پر موجود تھے، ان بچھڑوں سے مل کر انتہائی خوشی ہوئی، دیر تک ہم لوگ گلے ملتے رہے، بارہ بجے رات کو ہم لوگ اپنے سگے چچا سید صلاح الدین صاحب کے مکان ۴۹۔ ملیر ٹاؤن شپ کالا بورڈ میں پہونچے، تو عورتوں سے مل کر خوشی اور بھی دوبالا ہوئی۔

تقریب کی تیاری دوسرے دن ہی سے نکاح کی تقریب انجام دینے کی فکر ہو گئی، میری اہلیہ کے سگے بھائی عزیزی ڈاکٹر محمد فاتح نے پہلے ہی سے ہر قسم کی سہولتیں فراہم کر رکھی تھیں، وہ اس وقت لندن میں مقیم ہیں، میرے ساتھ اعظم گڈھ میں بچپن سے پرورش پائی، ان کو اپنی اولاد ہی کی طرح عزیز رکھا، ان کی سعادت مندی کی وجہ سے تمام اخراجات کا سامان ہو گیا جس کے لیے بارگاہ ایزدی میں شکر ادا کیا۔

بیگم صاحبہ سے ملاقات کراچی پہونچنے کے دو ہفتے کے بعد شادی خانہ آبادی کی تاریخ مقرر ہوئی، اسی اثناء میں استاذی محترم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی بیگم صاحبہ سے ملنے کے لیے بے چین رہا، کراچی پہونچنے کے دو تین روز کے بعد ہی ان کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ اپنی منجھلی لڑکی کے ساتھ عزیز آباد میں رہتی ہیں، جن کے شوہر ڈاکٹر عطاء اللہ آج کل سعودی عرب میں ملازم ہیں، بیگم صاحبہ اب بہت بوڑھی ہو گئی ہیں، آنکھوں کی روشنی بھی بہت کچھ زائل ہو چکی ہے، بس اتنی بصارت ہے کہ گھر میں چل پھر لیتی ہیں، اب ان کی زبان پر زیادہ تر اللہ اور رسول کی باتیں رہتی ہیں، ان کی بڑی لڑکی اپنے شوہر عاصم صاحب کے ساتھ علیحدہ مکان میں رہتی ہیں جو کراچی کے ہائی کورٹ میں ایڈوکیٹ ہیں، اب وہ بھی داماد والے ہو گئے ہیں، سید صاحب کی منجھلی صاحبزادی تو ہندوستان ہی میں ہیں، ان کے

ایک صاحبزادے کراچی آگئے ہیں، جو یہاں پولی ٹکنکل اسکول میں لکچرار ہیں، سید صاحب کے
صاحبزادے ڈاکٹر ابو سلمان ندوی ڈربن یونیورسٹی جنوبی افریقہ میں اسلامک اسٹڈیز کے صدر ہیں،
سید صاحب کی چھوٹی لڑکی کو پریشانیوں میں پایا، وہ بیوہ ہوگئی تھیں، نکاح ثانی ہوا لیکن یہ راس
نہ آیا، دعا ہے کہ اللہ تبارک و تعالےٰ ان کے اچھے دن واپس لائے، سید صاحب کے پہلے
محل سے عزیزی ابو سہیل بھی بنگلہ دیش سے لٹ پٹ کر کراچی پہونچ گئے ہیں، کسٹم آفیسر ہیں،
اب وہ بھی شاد اور بہبود والے ہوگئے ہیں، اچھے حال میں ہیں، پہلے محل سے سید صاحب کی ایک
صاحبزادی بھی تھیں، ان کے صاحبزادے عزیزی سید نقی اشرف اسٹیٹ بنک میں کلاس ون
کے افسر ہیں، ایک روز ہم سب ایک ساتھ جمع ہوئے، دارالمصنفین اور شبلی منزل کی ساری
گزشتہ باتیں مزے لے لے کر دہرائی گئیں، مگر اس کا بھی دکھ تھا کہ یہ ساری حقیقتیں اب
افسانے کی حیثیت سے دہرائی جارہی تھیں، بیگم صاحبہ نے فرمایا کہ انھوں نے بھوپال اور
کراچی میں سید صاحب کی بڑی تنخواہوں کے ساتھ زندگی بسر کی، مگر جو راحت اور آسودگی
دارالمصنفین کے احاطہ میں حاصل تھی وہ کہیں اور نہیں ملی، آمدنی کے ساتھ اخراجات بھی بڑھے،
اور بڑی تنخواہوں کے باوجود کوئی سرمایہ جمع نہ ہوسکا،

سید حسام الدین راشدی صاحب اور دارالمصنفین

کراچی پہونچ کر پاکستان کے مشہور اہل علم اور مصنف جناب سید
حسام الدین راشدی سے ملنے کا مشتاق تھا، ان سے ۱۹۵۵ء
سے ملاقات ہے، ۱۹۶۹ء میں کراچی آیا تھا تو انھوں نے ہر طرح کی خاطر مدارات کرکے نوازا
تھا، اپنے دولت کدہ پر کراچی کے تمام ارباب علم کو مدعو کرکے ان سے ملنے کا موقع دیا تھا،
پھر ان ہی کی معیت میں ہر علمی حلقہ میں پہونچا تھا، ان کے علم کے ساتھ ان کے حسن اخلاق اور
تواضع سے متاثر تھا، وہ دارالمصنفین کے بڑے قدرداں ہیں، یہاں پہونچنے سے پہلے میں نے

اُن کی خدمت میں ایک طویل خط لکھا تھا جس کا متن یہ تھا :-

پاکستان کے ناشروں کی سینہ زوری

" راشدی صاحب! دارالمصنفین اس وقت سخت مالی بحران سے گذر
رہا ہے، ہم لوگوں کا خیال تھا کہ جب ہندوستان اور پاکستان کے
درمیان تجارت پھر سے شروع ہوجائے گی، تو پاکستان میں دارالمصنفین کی مطبوعات
کی مانگ پہلے کی طرح پھر بڑھ جائے گی .... اس سے بڑی مالی وسعت پیدا
ہوجائے گی، ہم گذشتہ دس سال سے اس کا انتظار کررہے تھے، لیکن جب اس تجارت کے
کھلنے کی امید ہوئی، تو ہم کو پاکستان سے برابر یہ خبریں موصول ہورہی ہیں کہ ہماری
مطبوعات وہاں چھاپ کر فروخت کی جارہی ہیں، ایسے ناشروں نے اخلاقی طور پر
ہم کو اطلاع تک نہ دی، وہ خود تو ان مطبوعات کی آمدنی سے سرمایہ دار بن رہے
ہیں لیکن ہمارے ادارہ پر بڑی کاری ضرب لگا رہے ہیں، یہ ممکن ہے کہ ناقابل تلافی ہو
اگر مالی پریشانیوں میں مبتلا ہوکر یہ ادارہ بند کردیا گیا، تو اس کے خون ناحق کی ذمہ داری
پاکستان کے ناشروں پر ہوگی، اب جب کہ ہندو پاک کی تجارت شروع ہونے
والی ہے، پاکستان کے ناشر ہم سے براہ راست کتابیں درآمد کرسکتے ہیں، اس طرح
وہ فائدے اٹھاکر ہمارے ادارہ کو بھی مالی تباہی سے بچا سکتے ہیں، یہ اپنے
اخراجات زیادہ تر اپنی مطبوعات کی بکری سے پورا کرتا رہا ہے، ہندوستان کی مرکزی
حکومت کا رویہ اس کی طرف سے بڑا ہی خوشگوار اور ہمدردانہ ہے، اگر یہ
خواہاں ہو تو اس کو مرکزی حکومت سالانہ امداد بھی دے سکتی ہے، مگر یہ اپنی پرانی
روایت پر قائم رہنا چاہتا ہے، گذشتہ ساٹھ سال سے یہ اپنے ایثار پسند
خدمت گذاروں کے سہارے چل رہا ہے، جو اس سے قوت لایموت پھر وظیفہ لیکر

لے کر اپنی علمی سرگرمیوں کو جاری رکھے ہوئے ہیں، ان کی جیسی قربانی اور ایثار پسندی
کی مثال پورے برصغیر میں مشکل سے ملے گی، اس ادارہ سے جو مذہبی، تاریخی، ادبی
اور دوسرے موضوعات پر کتابیں شائع ہوئی ہیں ان پر اردو زبان کو فخر ہو سکتا ہے
پاکستان کے لوگ ہم سے سیاسی طور پر ضرور جدا ہو چکے ہیں، مگر اس ادارہ کے خدمت
گذاروں نے اس کے لئے جو قربانیاں کی ہیں اُن کی اہمیت کو وہ نظر انداز نہیں
کر سکتے۔ وہ اپنے ملک کے ناشروں پر اخلاقی دباؤ ڈال کر اس کو نقصان سے
بچا سکتے ہیں، اگر ان ناشروں کو اس کی کتابیں درآمد کرنے میں طرح
طرح کی رکاوٹیں پیدا ہوتی رہتی ہیں، تو یہ اپنی مطبوعات کا حق طباعت وہاں کے
ناشروں اور تاجروں کو فروخت کرنے کے لئے تیار ہے، مگر اس کے لئے معاہدہ سرکاری
سطح پر ہو، تاکہ اس کو جو معاوضہ ملنے کی امید ہو، وہ ہند و پاکستان کی حکومتوں
کے ذریعہ سے موصول ہو، شرائط کی تفصیلات باہمی گفتگو سے طے ہو سکتی ہیں،
اگر یہ شرائط طے ہو جائیں تو صرف سیرۃ النبی کی فروخت سے پاکستان میں لاکھوں روپے
پیدا کئے جا سکتے ہیں، ہم پھر پاکستان کے لوگوں اور اُس کی حکومت سے درخواست
کرتے ہیں کہ وہ اپنے یہاں کے ناشروں پر دباؤ ڈال کر ہمارے ادارہ کو ختم
ہونے سے بچائیں،

راشدی صاحب! آپ مولانا کوثر نیازی کی توجہ اس طرف مبذول کرائیں
کیونکہ وہ ہمارے ادارہ کی اہمیت اور قدر و قیمت سے اچھی طرح واقف ہیں"

انگریزی اخبار ڈان کا اداریہ

راشدی صاحب نے اس خط کو پاکستان کے تمام اردو اخبارات
کو بھیجا، میں اپنے ادارہ کی طرف سے ان اخبارات کے اڈیٹروں کا شکر گذار ہوں کہ انھوں نے

اس کو نمایاں طور پر شائع کیا، راشدی صاحب نے اس خط کا انگریزی ترجمہ کر کے انگریزی اخبارات
میں بھی بھیجا، پاکستان کے مشہور اخبار ڈان نے اس خط کو ۱۷ر جولائی ۱۹۷۵ء کی اشاعت میں
چھاپ کر اس پر ایک اداریہ بھی لکھا، جس کا خلاصہ یہ ہے،

"آج کی اشاعت میں ہم ایک خط کے اقتباسات شائع کر رہے ہیں جو دار المصنفین
اعظم گڈھ (ہندوستان) کے ناظم نے پیر حسام الدین راشدی کو لکھا تھا، جو پاکستان
کے بڑے ہی معروف و مشہور اہل علم اور مصنف ہیں، یہ خطاب کچھ خود ہی بول
رہا ہے، عرصہ سے دار المصنفین بہت ہی ممتاز اور نمایاں ادارہ رہ کر تاریخ اور اسلامی
علوم و فنون کی خدمت انجام دے رہا ہے، تقسیم ہند سے پہلے ہندوستان کے عظیم ترین
ارباب علم اس بے مثال ادارہ کے خدمت گذار رہے، یہاں کے اصحاب علم بہت ہی
ایثار اور قناعت کے ساتھ گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر علمی سرگرمیوں میں مشغول رہے،
وہ مادی راحتوں اور آسائشوں سے بے نیاز رہ کر اپنی ساری توجہ لکھنے پڑھنے،
تحقیقات کرنے اور کتابیں لکھنے میں صرف کرتے رہے، حالانکہ اُن سے کمتر درجہ کے
لوگ تعیشات کے ساتھ زندگی بسر کرنے کو اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں، اس
ادارہ کے خدمت گذار تھوڑی سی رقم اپنی خاص خاص ضروریات کو پورا
کرنے کے لئے قبول کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں، اس کے سرپرست متمول
طبقہ کے لوگ نہ تھے لیکن یہاں کتابیں برابر لکھی جاتی اور شائع ہوتی رہیں،
ایثار پسند لیکن مشہور اصحاب قلم نے اس عظیم ادارہ سے وابستہ رہ کر ایسی بیسیوں
کتابیں لکھی ہیں، جو پُر از معلومات ہیں، اور صبر آزما محنت و مشقت سے قلمبند
ہوئی ہیں، اور اُن سے ہمارا لٹریچر بہت ہی متمول ہوا ہے، ہم اس ادارہ کے

شکر گزار ہیں، کہ اُس کی بدولت اس وقت عربی زبان کے بعد اردو ہی کا مذہبی لٹریچر متمول ترین سمجھا جا رہا ہے،

خط سے ظاہر ہوگا کہ تقسیم ہند کے بعد اس ادارہ کو اپنے وجود کو قائم رکھنے میں جرأت مندانہ حوصلہ سے کام لینا پڑا، اس کی مطبوعات کی فروخت برصغیر کی تقسیم کے بعد بہت ہی کم ہوگئی، ہندوستان و پاکستان کی تجارت کے بند ہونے کی وجہ سے اعظم گڈھ کے اس ادارہ کو پاکستان سے کوئی آمدنی نہیں ہوتی رہی ہے، جو ناشر اُس کی کتابیں چھاپ لیتے ہیں، وہ اُس کو رائلٹی بھی نہیں دیتے، کچھ ناشر ایسے ہیں، جو اس کی کتابیں چھاپ رہے ہیں، بلکہ یہ کہا جائے تو صحیح ہوگا کہ اسکی مطبوعات پر ڈاکہ مار کر خود کثیر منافع حاصل کر رہے ہیں، یہ صحیح ہو کہ وہ قانونی گرفت میں نہیں آسکتے ہیں، لیکن وہ اخلاقاً اس کا حق نہیں رکھتے، کہ دوسروں کی دماغی محنت شاقہ کا پھل کھائیں، اور اپنے لئے سرمایہ جمع کریں، اور ایسے ادارہ پر ضرب کاری لگائیں، جو منافع کی خاطر اپنی علمی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے نہیں ہے، اس کی اہم ضرورت ہے کہ یہ ناشر اپنی اس بداخلاقی کو محسوس کریں، اور اعلیٰ اخلاق سے کام لے کر ایسی طباعت و اشاعت کو روک دیں، یہ ممکن ہے کہ کچھ ناشر مل کر ایسی صورت پیدا کر لیں کہ وہ اس ادارہ سے حق طباعت حاصل کرنے میں اس سے گفت و شنید کریں"

جناب شورش کشمیری مرحوم کا احتجاج

اس سے پہلے میں نے ایک خط جناب شورش مرحوم کاشمیری صاحب کو بھی (جن کو مرحوم لکھتے ہوئے دکھ ہو رہا ہے) لکھا تھا جس کو انہوں نے اپنے ہفتہ وار اخبار چٹان میں پاکستان کے ناشروں کی چوری اور سینہ زوری کے نام سے شائع کیا، پھر

اسی ہفتہ وار اخبار مورخہ ۱۶ جون ۱۹۷۵ء میں ایک بہت ہی پُر زور اداریہ لکھا جس کی سرخی یہ تھی، "بعض ناشروں کی چوری اور سینہ زوری" "سیرۃ النبی کراچی کے ایک ناشر نے کس برتے پر چھاپی ہے،" اس کا متن یہ تھا،

"علامہ شبلی نعمانی اور علامہ سید سلیمان ندوی کی واحد یادگار دار المصنفین اعظم گڈھ کے ناظم اور معارف کے مدیر سید صباح الدین عبد الرحمٰن کا ایک نامہ گرامی ہم نے چٹان کی ایک اشاعت میں شائع کیا تھا، اب ایک اور خط جو انھوں نے ۲۵ مئی ۱۹۷۵ء کو تحریر کیا ہے، ۴ جون کو اپنے دو ملکی سفر کے بعد ہم تک پہنچا، نذرِ قارئین ہے، سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب ایک بلند پایہ مصنف ہونے کے علاوہ برعظیم کے مسلمانوں کے علمی قرطبہ کی یادگار شخصیت ہیں، آپ کا خط پڑھئے اور دل کا اندازہ کیجئے۔

پاکستان کو اس پر ضرور غور کرنا چاہئے کہ علم و نظر اور دین و ادب کے کئی ایک دائرے ہندوستان میں ہیں، ہماری نگاہیں قدرتی طور پر اُن کی طرف اٹھتی ہیں، ہم کسی طرح بھی اپنی ملی تاریخ میں سے علی گڈھ، جامعہ ملیہ، دیوبند، ندوۃ، تحقیقات و نشریات اسلام اور دار المصنفین کو خارج نہیں کر سکتے۔

اب بھی ان اداروں سے علم و سیاست اور دین و ادب پر جامع، و مانع اعلیٰ اور عمدہ کتابیں شائع ہو رہی ہیں، ہم ان سے اس باب میں پیچھے ہیں، لیکن کیا یہ ظلم نہیں، کہ ان اداروں پر ستم توڑا جائے، اُن کی سرپرست اسلامی ریاستیں تباہ ہو گئیں، جن تجارت پر انکا انحصار تھا ان کا بڑا حصہ پاکستان اُٹھ کے آگیا، حتیٰ کہ دو ملکی کتابوں کی آمد و رفت موقوف ہو گئی، اس صورت حال سے بعض ناشروں نے

فائدہ اٹھانا شروع کیا ؛ علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی کی سیرۃ النبی کی چھ جلدیں کراچی کے ایک ناشر محمد سعید اینڈ سنز تاجران کتب قرآن محل مقابل مولوی مسافر خانہ کراچی نمبر۱ پاکستان نے چھاپ لی ہیں، اس کی پانچ جلدیں اس وقت ہمارے سامنے ہیں، ناشر نے سرورق کے صفحہ ثانی پر لکھا ہے :۔

"جملہ حقوق بحق ناشر حسب اجازت حکومت پاکستان (16) No P6

PB - P3 - 73/1055 deTed 21 - 4 - 73

تمام و کمال محفوظ ہیں ؛

ہمارے نزدیک اس کا نام ہے چوری اور سینہ زوری. ہم نہیں کہہ سکتے کہ ناشر نے حکومت پاکستان کے کس شعبہ سے اجازت لی، اس شعبہ نے کس استحقاق کی بنا پر اجازت دی، اور ادارہ کو اجازت کیوں دی گئی، افسر مجاز کون تھا، جہاں تہاں یہ کام ہوا، ہر لحاظ سے غلط ہوا، اس سلسلہ میں وزیر اعظم پاکستان کو متوجہ کرنا ہمارا فرض ہے، ہم توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس چوری اور سینہ زوری کے خلاف ایکشن لیں گے، اُن کے جن محکمہ نے اجازت دی ہے، اور جس افسر نے ایسا کیا ہے، ہمارے نزدیک وہ مخلص نہیں، ہم یہ شبہہ کریں کہ اس کی سنہری اور روپہلی مصلحتوں نے گل کھلایا ہے، تو غلط نہ ہوگا، .... ہم فی الحال کراچی کے دینی حلقوں سے متوقع ہیں کہ وہ ناشر کے متعلق فیصلہ کریں کہ اس کا جواب کیا ہو سکتا ہے، ناشر کے متعلق ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اُن کی رحلت ہو گئی، ہم اُن کے بیٹوں سے یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہیں کہ انھوں نے اس طرح اپنے والد کے لئے توشۂ آخرت مہیا کیا ہے؟"

دارالمصنفین کی حمایت میں فضا

ان تحریروں سے پاکستان میں دارالمصنفین کی حمایت میں بڑی اچھی فضا پیدا ہوئی ہیں جس حلقہ میں گیا، ان تحریروں کا ذکر آیا، اور پاکستان کے ناشروں کی اس بداخلاقی کی مذمت کی گئی، معلوم ہوا کہ پاکستان کے اور ناشر بھی دارالمصنفین کی مطبوعات کو مال غنیمت سمجھ کر اس کی لوٹ میں ہر طرف سے مشغول ہیں، یہاں کی تاریخ اسلام، تاریخ سندھ، بزم صوفیہ، اسوۂ صحابہ، شعر الہند، شعر العجم، ارض القرآن وغیرہ سب ہی کو چھاپ لیا ہے،

راشدی صاحب کی خدمت میں شکریہ

پاکستانی اخباروں کی تحریروں سے دارالمصنفین کے حق میں جو فضا پیدا ہوئی تھی، اس کے شکریہ کے مستحق زیادہ تر جناب سید حسام الدین راشدی صاحب ہیں، ایک رات جناب مولانا حسن مثنیٰ ندوی اڈیٹر ہر نیروز، سید ظفیر الحسن صاحب اسسٹنٹ ڈائرکٹر محکمہ انڈسٹریز اور میرے دوست پروفیسر سید حسن (پٹنہ یونیورسٹی) کے صاحبزادے سید اصغر حسن (رکن ایڈیٹوریل اسٹاف انگریزی اخبار ڈان) ملنے آئے، مولانا حسن مثنی ندوی پھلواری شریف پٹنہ کے رہنے والے تھے، مولانا سلیمان پھلواروی کے پوتے ہیں، بڑی باغ و بہار طبیعت پائی ہے، خاص اداؤں سے ہائے کہکر قہقہے لگاتے ہیں، انھوں نے اپنے اردگرد نوجوانوں کی ایک جماعت جمع کر رکھی ہے، جن میں وہ علمی ذوق پیدا کرتے رہتے ہیں، بڑے اچھے نثر نگار اور مقرر بھی ہیں، علمی حلقوں میں مقبول ہیں، ہر علمی جلسہ میں شریک ہوتے ہیں، شادی نہیں کی ہے، عروس علم ہی سے ہم کنار رہنے میں خوشی اور لذت محسوس کرتے ہیں، سید ظفیر الحسن صاحب سرکاری ملازم ہیں، لیکن بڑا اچھا علمی ذوق رکھتے ہیں، علمی سرگرمیوں میں پیش پیش رہتے ہیں، اصغر حسن سلمہ اپنی متانت کی وجہ سے زیادہ تر خاموش رہتے ہیں، ان تینوں قدردانوں سے مل کر طبیعت خوش ہوئی، ان ہی کی معیت میں سید حسام الدین راشدی صاحب کے یہاں پہنچا، پہلے وہ جمشید روڈ پر رہتے تھے، اب الحمرا سوسائٹی میں رہتے ہیں، ایک بڑی کوٹھی خرید لی ہے، جو جدید

ساز و سامان سے آراستہ و پیراستہ ہے، اسی میں اپنی علمی جنت آباد کر رکھی ہے، مجھ کو دیکھتے
کے ساتھ ہی بہت ہی اخلاص و محبت سے گلے لگا لیا، ایسا معلوم ہوا کہ دو بچھڑے دلوں کا ملاپ
ہو رہا ہے، انہی سے معلوم ہوا کہ انھوں نے مولانا کوثر نیازی وزیر مذہبی امور، حکومت پاکستان
کو بھی خط لکھ کر دار المصنفین کے ساتھ پاکستانی ناشروں کی زیادتی کی طرف توجہ دلائی ہے" وہ
مجھ کو اسلام آباد بلا کر اس سلسلہ میں گفتگو کریں گے، اور دار المصنفین کی مدد میں ہر قسم کے
اقدام کریں گے، میں نے ان کا شکریہ ادا کیا، وہ سندھی ہیں، سندھیوں کے یہاں خاطر مدارات
اور تواضع کرنے کی بہت اچھی روایت ہے، اس موقع پر بھی راشدی صاحب نے اس روایت
کو برقرار رکھا،

ڈاکٹر معین الحق

جناب سید حسام الدین راشدی صاحب کے یہاں سے جناب ڈاکٹر معین الحق
کے یہاں گیا، جو پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے جنرل سکریٹری ہیں، وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
کے اسٹاف میں رہ چکے ہیں، تقسیم ہند کے بعد کراچی چلے آئے، اور یہیں ایک علمی خدمت گذار کی
باوقار زندگی بسر کر رہے ہیں، ایک اچھی کوٹھی بھی بنوالی ہے، اور جس سڑک پر ان کا مکان ہے
اس کا نام ڈاکٹر معین الحق روڈ رکھ دیا گیا ہے، انھوں نے کئی کتابیں مثلاً تذکرۃ الخواتین
جلد اول (فارسی م) ابن خلکان کی وفیات الاعیان کی چھ جلدوں کے انگریزی ترجمے
از ام۔ ڈی سلین، سرسید احمد خاں کی آثار الصنادید، اور سرکشی بجنور، شاہ عالم اور اکبر شاہ
ثانی دہلی کے حالات پر مشتمل اخبار رنگین اڈٹ کی ہیں، انگریزی میں برنی کی تاریخ تغلق، اورنگ زیب
ایک شاہزادہ کی حیثیت سے اور ۱۸۵۷ء کا انقلاب عظیم لکھی ہیں، اردو میں اسلامی ہند
و پاکستان کی معاشرتی و علمی تاریخ، اسلامی عہد میں فن تعمیر، تاریخ ہند و پاکستان وغیرہ کے نام
سے کتابیں قلمبند کی ہیں، ہمایوں کے حالات میں اس کے اتالیق جوہر نے تذکرۃ الواقعات کے

نام سے جو تاریخ لکھی ہے اس کا ترجمہ بھی اردو میں کیا ہے، اس وقت وہ جنرل آف دی پاکستان
ہسٹاریکل سوسائٹی کے اڈیٹر ہیں، پاکستان میں ہسٹری آف فریڈم موومنٹ" کے نام سے جو کتاب
کئی جلدوں میں لکھی گئی ہے، اس کی ادارتی مجلس کے بھی سکریٹری ہیں، اردو کا ایک رسالہ
البصائر بھی کچھ دنوں تک اپنی ادارت میں شائع کرتے رہے، میرا اور ان کا موضوع مشترک
ہے، اس لیے ان سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، اثنائے گفتگو میں انھوں نے یہ کہہ کر مجھکو نوازا کہ میری
کتابوں سے یہاں کے لوگ ([illegible]) ہو رہے ہیں، میں نے کہا کہ میں اپنی کتابوں کو تو
اس لائق نہیں سمجھتا ہوں، مجھکو روک کر کہا زیادہ خاکساری کو راہ نہ دیجئے یہ ایک حقیقت
ہے جس کا اظہار کر رہا ہوں، مجھ سے پھر کہنے لگے کہ میں نے ملفوظات خواجگان چشت پر جو کچھ لکھا
ہے، اس کو انگریزی میں جلد از جلد منتقل ہونا چاہئے، تاکہ مستشرقین بھی ان ملفوظات کی اہمیت
اور حیثیت سے واقف ہوں، یہ ان ملفوظات کے جو جعلی اور فرضی قرار دینے کی مہم جاری ہے
اس کی تردید مستشرقین تک بھی پہونچنی چاہئے، انھوں نے کہا کہ وہ اس کے ترجمے کا انتظام
کرائیں گے۔

خواجہ محمد مشفق

ڈاکٹر معین الحق صاحب کی خاطر تواضع کے بعد خواجہ محمد مشفق صاحب کے
پاس ہم لوگ پہونچے، وہ پہلے انجمن ترقی اردو کے سکریٹری تھے، اب اس سے خود علحدہ ہو گئے
ہیں، اور اپنے گھر پر اردو کے مخطوطات پر کام کر رہے ہیں، ان کے گھر پر ان کا ذاتی کتبخانہ
بہت اچھا ہے، اردو کی تمام ضروری کتابوں پر نظر پڑی، انگریزی اور فارسی کی بھی کتابیں ہیں
ان کو بہت ہی دل نواز مصنف پایا، ان کو اپنے کتب خانہ میں بیٹھ کر شاید وہی سرور حاصل
ہوتا ہے جو کسی مےخوار کو میخانہ پہونچ کر ہوتا ہے، ان کے مضامین اخبارات میں برابر شائع
ہوتے رہتے ہیں جو شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔

لڑکی کا نکاح

ان حضرات سے ملنے میں اچھا وقت گذر رہا تھا، مگر لڑکی کی شادی کی تقریب ابھی انجام دینی تھی، اس لئے کچھ ذہنی سکون حاصل نہ تھا، الحمد للہ ۳۰ ر اگست کو یہ تقریب بخیر و خوبی انجام پاگئی، کراچی میں کسی تقریب کے انجام دینے میں یہ سہولت ہوتی ہے کہ ہر چیز کرایہ پر مل جاتی ہے، مگر ظاہر ہے کہ خرچ بہت زیادہ ہوتا ہے، اس شہر میں میرے اعزہ ہم وطن اور اعظم گڈھ کے دوست اور ملنے والے بکثرت موجود تھے، ان کو مدعو کرنا ضروری تھا، کراچی میں دار المصنفین کے قدر دانوں کو بھی مدعو کیا، جناب سید حسام الدین راشدی صاحب، ڈاکٹر معین الحق، خواجہ مشفق صاحب، پروفیسر ایوب قادری، جناب اعجاز الحق قدوسی، ڈاکٹر معز الدین ڈائرکٹر اقبال اکیڈمی، مولانا حسن مثنی ندوی، پروفیسر احسان رشید، ظہیر الحسن اور سید اضوحسن وغیرہ نے بھی شرکت کر کے نوازا، اعزہ و اقربا بھی بکثرت شریک ہوئے اور الحمد للہ ہنسی خوشی کے ساتھ اس فرض سے سبکدوش ہو گیا۔

جناب زاہد ملک صاحب

یکم ستمبر ۱۹۷۵ء کو جناب زاہد ملک صاحب جوائنٹ سکریٹری وزارت امور مذہبی حکومت پاکستان مولانا کوثر نیازی وزیر امور مذہبی کی طرف سے میری قیام گاہ پر ملنے آئے، اُن کو بہت ہی خلیق متواضع خاکسار ذہین اور معاملہ فہم پایا، وہ مولانا کوثر نیازی کی طرف سے مجھ سے یہ دریافت کرنے آئے تھے کہ دار المصنفین کی مطبوعات کو یہاں کے جو ناشر چھاپ کر اس کو نقصان پہنچا رہے ہیں، اس کے انسداد کے لیے کیا اقدام کئے جا سکتے ہیں، میں نے ان کو بتایا کہ یہاں کے ناشر کی روک تھام تو عارضی طور پر کر دی جاتی ہے، مگر وہ موقع پاتے ہی پھر چھاپنا شروع کر دیتے ہیں، جب جناب افضل اقبال صاحب ہندوستان میں پاکستان کی طرف سے ڈپٹی ہائی کمشنر تھے، تو ۱۹۶۵ء میں ان کی توجہ اس طرف دلائی گئی تھی، انھوں نے از راہ کرم حکومت پاکستان کو اس پر آمادہ کیا تھا کہ وہ دار المصنفین کو اس نقصان سے بچائے، اس زمانے میں حکومت کی طرف سے

ایک آرڈیننس جاری ہوا کہ بیرونی مصنفوں کی کتابیں حکومت کی اجازت کے بغیر نہیں چھاپی جا سکتی ہیں، کچھ دنوں اس کی وجہ سے دار المصنفین کی مطبوعات کی طباعت یہاں رکی رہی، مگر کچھ ناشروں نے پھر کچھ کتابیں شائع کر دیں تو ۱۹۶۹ء میں جناب ممتاز حسن صاحب مرحوم کی صدارت میں ایک ایسی کمیٹی کی تشکیل کی گئی جو دار المصنفین کی مطبوعات کی نگراں اور محافظ بن کر ایسے ناشروں کے خلاف قانونی کارروائی کرتی رہے، جو اس کی اجازت کے بغیر کتابیں چھاپیں، یہ کمیٹی کچھ دنوں مفید رہی، مگر ۱۹۷۱ء کے ہنگاموں کے بعد یہ کچھ زیادہ موثر ثابت نہیں ہوئی، میں نے جناب زاہد ملک صاحب سے عرض کیا کہ دار المصنفین کے بس کی یہ بات نہیں کہ ناشروں کے خلاف مقدمہ بازی کرے اس لئے اب ہمارا ارادہ تمام مطبوعات کو حکومت کے نذر کرنے کے لئے ہے وہ خود چھاپے اور اس کے بدلے میں یکمشت خاطر خواہ رائلٹی دیدے تاکہ اس سے یہ ادارہ پاکستان کے مارکٹ کے کھو جانے کی تلافی کر سکے، اسی کے ساتھ میں نے ان سے یہ واضح طور پر کہا کہ پاکستان سے یہ رائلٹی اسی وقت قبول کی جا سکتی ہے، جب میری حکومت اس کو قبول کرنے کی باضابطہ اجازت دے گی، اور یہ رقم سرکاری سطح پر منتقل ہو کر دار المصنفین پہونچے گی، اگر یہ ممکن نہ ہو سکا تو حق طباعت کی بات ختم ہو جائے گی، جناب زاہد ملک صاحب نے میری اس رائے سے اتفاق کیا، اور کہا کہ حکومت اس تجویز پر ضرور غور کرے گی، اور خود ہی بتایا کہ یہاں کا نیشنل بک فونڈیشن حکومت کی سرپرستی میں کام کر رہا ہے، اس کو یہ حق طباعت دیا جا سکتا ہے، انھوں نے اس کے سکریٹری جناب یونس سعید صاحب سے ایک ملاقات کرانے کا وعدہ کیا۔

نیشنل بک فونڈیشن

دوسرے دن محکمۂ امور مذہبی کے ایک افسر جناب افضل شیخ صاحب میری قیام گاہ پر گاڑی لے کر آئے اور نیشنل بک فونڈیشن ساتھ لے گئے، جناب یونس سعید صاحب سے

مل کر خوشی ہوئی، ان سے حق طباعت پر گفتگو ہوئی، وہ اس کام کو حکومت کی باضابطہ اجازت سے سرانجام دینے کے لیے تیار ہو گئے

وہ خود یہاں کے ناشروں کی بددیانتی اور سینہ زوری کے شاکی تھے، پھر انھوں نے اپنی مطبوعات کی لائبریری دکھائی، اسکول کالج اور یونیورسٹی کے نصاب کی ساری کتابیں اسی کی طرف سے شائع ہوتی رہتی ہیں، اور بہت ہی سستی قیمت پر طلبہ کو دی جاتی ہیں، میڈیکل انجینیرنگ اور سائنس کی نصابی کتابیں جو بیرونی مصنفوں کی ہوتی ہیں وہ بھی یہاں سے شائع کیجاتی ہیں، اور طلبہ کو آسانی سے کم قیمت پر مل جاتی ہیں، ان نصابی کتابوں کے علاوہ اور بھی اہم کتابیں انگریزی اور اردو میں شائع ہوتی رہتی ہیں،

جناب سید حسام الدین راشدی کی نوازش

۱۴ ستمبر کو جناب سید حسام الدین راشدی صاحب نے رات کو اپنی کوٹھی پر از راہ لطف و کرم کھانے پر مدعو کیا، وہاں اپنے عزیز ڈاکٹر سید راشد مصطفےٰ کے ساتھ پہونچا تو اور مہمانوں کے ساتھ جناب پروفیسر شیخ عبدالرشید صاحب، جناب بشیر احمد ڈار اور ڈاکٹر ریاض الاسلام بھی موجود تھے،

جناب پروفیسر شیخ عبدالرشید

مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے شعبۂ تاریخ کے بہت ہی لائق اور مقبول پروفیسر رہ چکے ہیں، پروفیسر محمد حبیب کے بعد وہی اس کے صدر رہے، تقسیم ہند کے بعد بھی وہیں تھے، ریٹائر ہونے کے بعد کراچی آکر مقیم ہوئے، وہ بڑی محبت سے ملے جب ان کو معلوم ہوا کہ میں نے بھی علی گڈھ میں کچھ تعلیم پائی ہے تو پھر علی گڈھ ہی پر گفتگو شروع کر دی، ان کے ہر بن مو سے علی گڈھ کی صدا نکل رہی تھی، وہ وہاں کے تازہ ترین حالات سے باخبر تھے، اور ایسی باتوں کی اطلاع دے رہے تھے، جس کی خود مجھکو خبر نہ تھی، علی گڈھ کا موضوع اتنا طویل ہو گیا کہ جناب سید حسام الدین راشدی صاحب کو آخر کہنا پڑا کہ اب ان کا پیمانۂ صبر لبریز ہو رہا ہے۔

علی گڈھ والوں کی عجیب خصوصیت ہے کہ وہ جب ملتے ہیں تو علی گڈھ کے علاوہ کسی اور چیز سے متعلق گفتگو کرنا پسند نہیں کرتے، آخر اس موضوع کو روکنا پڑا، روانگی سے ایک روز پہلے شیخ صاحب سے ملنے گیا تو کہنے لگے کہ کاش وہ علی گڈھ ہی میں مستقل طور سے سکونت پذیر ہو جاتے، وہ کراچی یونیورسٹی میں کچھ کلاسز بھی لیتے رہتے ہیں، اور پڑھاتے اور تقریر کرتے وقت پرانی یاد تازہ کر دیتے ہیں، ان کی طبیعت ابھی تک باغ و بہار ہے،

جناب بشیر احمد ڈار صاحب

جناب بشیر احمد ڈار صاحب پہلے اقبال اکیڈمی کے ڈائرکٹر تھے، وہاں سے سبکدوش ہو کر گھر ہی پر علمی کاموں میں مشغول رہتے ہیں، انکو بہت ہی متین سنجیدہ خاموش باوقار خاکسار علم دوست اور علم نواز پایا، بولتے کم ہیں مگر جو کچھ انکی زبان سے نکلتا ہے اسمیں وزن ہوتا ہے، وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں جنمیں دو مجھکو نذر کیں، ایک تو (Religious Thought of Saiyid Ahmad Khan) اور دوسری (Iqbal and Post-Kantian Voluntarism) انکا خاص موضوع فلسفہ ہے، اسلئے انکی تحریروں میں فلسفیانہ رنگ غالب رہتا ہے، سرسید کے مذہبی خیالات کے عنوان سے جو کتاب لکھی ہے اسکو خالی اوقات میں پڑھتا رہا، اسمیں ۱۲ ابواب ہیں، شروع میں لائق مصنف نے بہت ہی مبصرانہ انداز میں یہ دکھایا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے آتے ہی عیسائیت کس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کے ذہن پر اثر انداز ہو رہی تھی، اور جب اسکو انگریزوں کی حکومت کا سہارا ملا تو اسکے مبلغین ہندو مت اور اسلام کیلئے خطرناک ہو گئے، اسکے جواب میں ہندو مصلحین میں راجہ رام موہن رائے، کشب چندر سین، رام کرشن، سوامی دیانند وغیرہ نے پہلے تو مدافعانہ رنگ اختیار کیا، مگر پھر تبلیغ کر کے دوسروں کو ہندو مذہب میں داخل ہونے کی دعوت دینے لگے، مصنف نے مسلمان مصلحین میں سے شاہ ولی اللہ، سید احمد بریلوی، شاہ اسمٰعیل شہید، حاجی شریعت اللہ، حاجی محمد محسن، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، مولوی کرامت علی، مولوی مملوک علی، مولانا قاسم نانوتوی، دہلی کالج کے مولوی نذیر احمد، مولانا الطاف حسین حالی، مولوی ذکاء اللہ کی مذہبی سرگرمیوں پر تبصرہ کیا ہے، ان کا خیال ہے کہ اس وقت میں مسلمان ذہنی اور تعلیمی حیثیت سے ہندوؤں سے بہتر تھے (ص ۶) لیکن ان کو دکھ تھا کہ ان سے حکومت چھینی جا رہی

تھی اسلئے اُن کی اصلاحی کوششیں انکی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے دبی رہیں' (ص ۹۳) مسلمان اپنی حکومت کی وجہ سے اچھی اچھی ملازمتوں پر بھی تھے مگر انگریزوں نے رفتہ رفتہ انکو ملازمتوں سے برطرف کرنا شروع کیا، ملازمتوں کی وجہ سے ہندوؤں نے انگریزی پڑھنی شروع کی .... مسلمانوں کو اپنی مشرقی طرز تعلیم ہی پر بھروسہ رہا، جس سے وہ ملازمتوں میں ہندوؤں کا مقابلہ کرنے میں پیچھے رہ گئے، اس کے علاوہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت کے سلسلہ میں ہندوؤں نے ان سے تعاون کیا، جس کی بدولت وہ اقتصادی حیثیت سے بھی اچھے رہے' (ص ۷۱) یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کی شورش میں انگریزوں نے مسلمانوں کو کچل کر رکھ دیا، مسلمانوں کی اقتصادی اور سیاسی زبوں حالی سے سید احمد خاں متاثر ہوئے، انھوں نے انگریزوں کی حکومت سے تعاون کیا، جس کو جمال الدین افغانی نے اچھی نظر سے نہیں دیکھا، کیونکہ تمام اسلامی ممالک میں انگریز جو کچھ کر رہے تھے، اس سے وہ بدظن تھے، فاضل مؤلف کا خیال ہے کہ سرسید نے اس وقت جو روش اختیار کی وہ ہندوستان کے سیاسی حالات کی بنا پر درست تھی (ص ۱۴۱) اس دور میں مسلمانوں کا مقابلہ نہ صرف انگریزی حکومت سے رہا، بلکہ وہ عیسائی مبلغین سے بھی برسرپیکار رہے، جہانگیر کے زمانہ سے عیسائی مبلغین اسلام کو بدنام کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے، عیسائی پادریوں نے آئینۂ حق نما اور میزان الحق لکھکر اسلام پر حملے کئے' (ص ۴۸) اور جب ولیم میور کی لائف آف محمد شائع ہوئی، تو سید احمد خاں کی غیرت اور حمیت بروے کار آئی، انھوں نے خطبات احمدیہ میں اس کے اعتراضات کے مدلل جواب دیئے، اسی کے ساتھ انھوں نے انجیل کی تفسیر لکھی، جس میں وہی انداز بیان اختیار کیا، جو ولیم میور نے کیا تھا، انھوں نے معاندانہ رنگ کے ساتھ عیسائیوں کے عقائد پر جارحانہ حملے کئے، اور پُر زور طریقہ پر یہ ظاہر کیا، کہ خود لوتھر نے اسلامی تعلیمات وعقائد سے متاثر ہو کر ریفارمیشن کی تحریک چلائی، اگر وہ اور زندہ رہتا تو عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث کا بھی منکر ہو جاتا' (ص ۱۲۷) اس زمانہ میں یہ بحث بھی چل نکلی تھی کہ مذہب کا عقل اور عقلی دلائل کے مطابق

ہونا ضروری ہے، انگریزی تعلیم پانے والے نوجوان اس سے متاثر ہو رہے تھے، سرسید نے اس چیلنج کو بھی قبول کیا، اس سلسلہ میں فاضل مؤلف نے نیچر اور عقل پر فلسفیانہ بحث کرکے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ سید احمد خاں نے محققانہ طور پر یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام عین نیچر ہے اور نیچر عین اسلام ہے' (ص ۱۵۲)

اس زمانہ میں کچھ لوگوں کو بدگمانی پیدا ہوگئی تھی کہ سرسید نیچری اور دہری ہوگئے تھے، مصنف نے اس کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سید احمد خاں نے نیچر کی بحث اٹھا کر صرف یہ یقین دلایا ہے کہ اسلام نیچر کا مذہب ہے، نیچر اسباب وعلل کا نام ہے، اور اسی کے تشکیل کرنے والے کو خدا کہا جاتا ہے' (ص ۸۴)

وہ کسی حال میں خدا کے منکر نہیں ہوئے، اس کتاب میں سرسید کے جو خیالات جنت، دوزخ، قرآن، حدیث، نبوت، عذاب وثواب، نجات، وضو، حج، جہاد، وراثت، وصیت، سود، ربا، جبر و اختیار سے متعلق تھے، ان کا پورا تجزیہ کیا ہے، اس سے بعض ناظرین کا متفق ہونا ضروری نہیں، کیونکہ سرسید احمد خاں کے مذہبی خیالات سے بعض راسخ علماء کو بھی اختلاف رہا، لیکن اُن کے اخلاص میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا، انھوں نے اس زمانہ کے لحاظ سے اسلام کی جو تعبیریں اور تاویلیں کیں، ان میں اُن کے حسن نیت کے علاوہ کوئی اور چیز درمیان میں نہ تھی، خود مصنف کو سرسید کے بعض خیالات ورجحانات سے اختلاف ہے، لیکن زیر نظر کتاب کے آخری باب سید احمد اور موڈرنزم میں اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ سید احمد خاں اسلامی تعلیمات کی تعبیرات میں رواداری کو راہ دے کر ان میں جدید رنگ کے مطابق ترقی کے خواہاں ہوئے، انھوں نے جو جرأت مندانہ اقدام کئے، وہ اُن کے عہد میں تو کامیاب نہیں ہوئے، مگر اب جب مغربی تمدن کی وجہ سے مادی رجحانات پیدا ہو رہے ہیں، اُن کا مقابلہ کرنے

کیلئے سید احمد نے جو اسلام پیش کیا تھا، اسکو سمجھ کر ایک موثر ذریعہ بنانے کی ضرورت ہو (ص ۲۷) لائق مصنف سرسید کے مذہبی خیالات
کے اتنے معترف ہیں کہ اُن کا خیال ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن میں جو تفسیر لکھی ہے اس میں وہی سب کچھ ہے جس کا
بیج سرسید نے ڈالا تھا، بلکہ اقبال اپنے فلسفیانہ خیالات کے باوجود قرآن کے بعض نکات کے ادراک میں سید احمد خاں سے
آگے نہیں جا سکے ہیں، عذاب، ثواب، جنت اور دوزخ سے متعلق اُن کے وہی خیالات ہیں جو سید احمد خاں کے تھے (تمہید ص) لائق
مصنف نے اس کتاب میں سرسید احمد خاں کے متنازعہ فیہ رجحانات سے متعلق اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے
لیکن ان کے انداز بیان میں غور و فکر کے ساتھ متانت اور سنجیدگی ہے جس کے مطالعہ سے بہت کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے، میرے
سامنے اُن کی اس کتاب کا دوسرا اڈیشن ہے جس سے ظاہر ہے کہ ان کا پہلا اڈیشن دلچسپی سے پڑھا گیا، یہ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک
کلچر، کلب روڈ سے شائع ہوئی ہے، ضخامت ۲۹۷ صفحے ہے، قیمت ساڑھے سترہ روپیہ ہے، فاضل مؤلف نے اقبال پر جو
مذکورہ بالا کتاب بھی لکھی ہے اس کا بھی مطالعہ اس سفر میں کرتا رہا، اس میں بھی ضمیر اور عقل پر بحث ہے، ان مباحث کو پڑھتے وقت مسلم یونیورسٹی
کا ایک سمینار یاد آگیا جو کچھ سال پہلے پروفیسر آل احمد سرور کی صدارت میں سرسید احمد خاں پر ہوا تھا، اس میں حیدرآباد کے ایک
مقالہ نگار نے بڑے جوش کے ساتھ یہ پیش کیا تھا کہ اگر وحی بھی عقل کے مطابق نہ ہو تو یہ قابل قبول نہیں، اس قسم کی بحث تو پہلے بھی
ہو چکی ہے، ڈپٹی نذیر احمد نے اپنی تصنیف ابن الوقت میں مذہب اور عقل کے عنوان سے اس پر پوری بحث کی ہے، خود سرسید احمد
بھی اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ ضمیر کو ہی ایسا رہنما قرار نہیں دیا جا سکتا ہے جس سے غلطی نہ ہو (ص ۱۶۹ ملیجس تھاٹ آف سید احمد خاں)
یہی بات عقل کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے، پھر مذہب خصوصاً وحی کو عقل کے ماتحت کرنے کی کوشش کہاں تک صحیح قرار
دی جا سکتی ہے، جناب بشیر احمد ڈار نے اقبال پر جو کتاب لکھی ہے اس میں انھوں نے کانٹ کا یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ انسانی
عقل زندگی کی سچی قدروں کو متعین کرنے میں ہماری تنہا رہنما نہیں ہو سکتی ہے، (ص ۲۹) اقبال نے بھی اسی کی تلقین کی ہے
جیسا کہ بشیر احمد ڈار صاحب نے ان کے اشعار کو نقل کر کے بتایا ہے،

خرد واقف نہیں نیک و بد سے ۔۔۔ بڑھی جاتی ہے ظالم اپنی حد سے
گزر جا عقل سے آگے کہ یہ تو ۔۔۔ چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

(باقی)

فخر الملک خواجہ فضل اللہ العمید تولکی

از

جناب ڈاکٹر نور السعید اختر صاحب، استاذ شعبۂ فارسی مہاراشٹر کالج بمبئی

(۲)

ہم عصر شعراء — عمید کے ہم عصر شعراء کی فہرست طویل نہیں ہے، ان میں سب سے زیادہ قابل ستائش شخصیت
شہاب الدین مہمرہ کی ہے جنھیں امیر خسرو نے استاد تسلیم کیا ہے، علاوہ ازیں تاج الدین ریزہ
حسن سجزی، اور مولانا منہاج الدین سراج جیسی فخر زمان ہستیاں بھی تھیں، مولانا سراج
نے طبقات ناصری (۶۵۸ھ) میں عمید کا ذکر کیا ہے، شہاب الدین مہمرہ اور تاج الدین ریزہ
کا کلام چونکہ نایاب ہے، لہٰذا عمید سے متعلق اُن کے خیالات و تاثرات کا پتہ نہیں چلتا،
البتہ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ امیر خسرو نے عمید سے متعلق کوئی حوالہ نہیں دیا،

امیر خسرو کا سنہ پیدائش ۶۵۱ھ مطابق ۱۲۵۳ء ہے، اس اعتبار سے خسرو کی پیدائش
کے وقت عمید کی عمر ٹھیک پچاس برس کی تھی، خسرو کی شاعری کی ابتدا ۶۷۵ھ کے
قریب ہوتی ہے، جب کہ عمید کی عمر ۷۵ برس کی ہوگی، لیکن عمید کے متعلق اُن کے یہاں کوئی
بھی اشارہ نہیں پایا جاتا، تاہم خسرو کے دیوان میں چند ایسی غزلیں ملتی ہیں جن کا
آب و رنگ عمید سے ملتا جلتا ہے، ممکن ہے گل رعنا کے مؤلف نے اسی بنا پر یہ رائے قائم کر لی ہو
"کہ امیر خسرو دہلوی بخدمتش رسیدہ"[1]

---

[1] بحوالہ بزم مملوکیہ ص ۲۰۵،

عمید کے دستیاب شدہ کلام میں بھی بادشاہِ وقت کے علاوہ کسی اور کا ذکر نہیں ملتا ہے، البتہ کلیاتِ بدر شاشی میں عمید کا تذکرہ پایا جاتا ہے، بدر نے اُن کی مدح میں قصیدہ بھی کہا ہے، اور اس میں اُن کی بزرگی اور خطاب کی طرف اشارہ کیا ہے،

عمید کی شاعرانہ عظمت

عمید کی شاعرانہ عظمت کا صحیح اندازہ تذکرہ نویسوں اور مورخین کے ان بیانات سے بخوبی کیا جا سکتا ہے، ملا عبدالقادر بدایونی عمید کو "ملک ملوک الکلام" کے شاندار لقب سے یاد کرتے ہیں، عہدِ تغلق کے ملک الشعراء فخر الزماں بدر الدین بدر شاشی (تاشقندی)[1] عمید کی عظمت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں:-

ایا بزرگ عمیدی کو ارمغانی خوب	عروس نظم پذیرد ز مدحِ تو زیور[1]

تقی اوحدی لکھتے ہیں:-

"عمید الدین یکے از اعاظم حکما و افاضل قدما است، عمید اقلیم سخنوری و حید زمانِ معنی پروری، آفتابِ جہانگیر کمال، مہر سپہر قدر و جلال، نورِ فطرتش پنجہ در پنجہ خورشید افگندہ و علو فکرتش سر بسر سپہر اثیر نہادہ، در صنائع و بدائع معانی بیانش سحر بر دارد و در متانت و رزانت سخندانی و ہنش صاحب اعجاز است"[2]

عمید کی بوقلمون طبیعت متعدد صفات اور گونا گوں خصوصیات کا احاطہ کرتے ہوئے مؤلفِ آتشکدہ لطف علی بیگ آذر نے نہایت جامع رائے دی ہے، وہ لکھتے ہیں:-

"عمید الدین از اعاظم و افاضل قدما است، و در مراسم سخن پردازی مہارت تمام داشتہ"

تذکرہ گلِ رعنا کے مؤلف بھی زاین شفیق کی گراں قدر رائے عمید نزید طرۂ امتیاز

---

[1] کلیات بدر و عمید ص ۲۶۵ - [2] اردو پرشین پوئٹس، اقبال حسین، ص ۲۰۴،

رکھتی ہے، انھوں نے عمید کو ہندوستان کا مشہور و معروف فاضل اور شاعر تسلیم کیا ہے،

"عمید الدین از اعظم فضلاء و شعرائے ہندوستان بود"[1]

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عمید کی عظمت و رفعت کے سورج کو وہ تابانی حاصل نہ ہو سکی جو اُن کے عہد کے اُبھرتے ہوئے شاعر امیر خسرو کو حاصل ہوئی، اس کی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں، سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ عمید نے شاعری کی اس صنف کو اپنی جولانگاہ بنایا تھا، جس کی ہندوستان میں داغ بیل شہاب الدین مہمرہ نے ڈالی تھی، فارسی شاعری میں نعت گوئی کی ابتدا گو کہ ایران میں ہوئی لیکن مہمرہ اور عمید نے اس میدان میں طبع آزمائی کے کامیاب جوہر دکھائے عمید نے اس حقیقت کی طرف خفیف سا اشارہ بھی کیا ہے، ملاحظہ ہو،

جوانی از غزل پیری از نصائح ماند	بروقت شیوۂ تجنیس در ستم تضمین شد[2]
بختم نعت عمید است کنوں بگوی بادا	شفاعتش بقیامت مرا معین و موافق[3]

تو کہ مخصوص ازیں صنف بتشریف سخن	خلعت خاص نزعت (ز ازل) ایجا شد[4]
عمید خستہ را در پردۂ نعت	مبادا یادت از خاطر حرام است[5]
آخرت را تخم نعت افگن کہ در دنیا عمید	بتر آنیش ہیں آمین کشت آوردہ اند[6]

مندرجہ بالا اشعار کے غائر مطالعہ سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ عمید نے جوانی میں غزل سرائی کی اور بعد میں نعت گوئی کو اپنا شعار بنا لیا، ورنہ بہت ممکن تھا کہ آج عمید کو خسرو پر فوقیت حاصل رہتی۔ عمید کے مقبول عام نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے، کہ عبدالقادر بدایونی نے

---

[1] بزم مملوکیہ از سید صباح الدین ص ۲۰۵، [2] کلیات بدر و عمید ص ۳۲۲، [3] ایضاً ص ۲۹۶ [4] ،، ص ۳۰۷، [5] کلیات بدر و عمید ص ۳۲۷، [6] ایضاً ص ۳۳۱،

منتخب التواریخ کی تصنیف کے وقت سنہ ۱۰۰۴ھ میں کلام عمید کی نایابی کا ذکر کیا ہے، اور تمام دستیاب شدہ کلام کو ۳۰ صفحات پر محیط کر دیا، خوش قسمتی سے اب عمید کا بیشتر کلام دستیاب ہوا ہے، جس کے مطالعہ کے بعد عمید کی عظمت ظاہر ہوتی ہے:

عمید اور ماقبل شعراء

عمید کی قادر الکلامی میں کلام نہیں، انھیں تمام علومِ متداولہ خصوصاً نجوم، ہیئت، فلکیات، فلسفہ، منطق، تاریخ، جغرافیہ، لغت، تمثیلات، و تلمیحات، اور ادب پر پوری قدرت حاصل تھی، عمید کے قصائد اُن کی علمیت پر دلیل ہیں، دراصل اُن کے قصائد علوم کا بحرِ زخار ہیں، صرف مدحیہ قصائد ہی سے اُن کی علمی استعداد کا پتہ نہیں چلتا، بلکہ اُن کے حبیہ قصائد سے بھی اُن کی جدتِ طبع کا اندازہ ہوتا ہے، انھوں نے خاقانی اور انوری کی طرح جابجا شاعرانہ تعلّی سے کام لیا ہے، اور بڑے زعم کے ساتھ اپنے وحیدِ عصر ہونے کا دعویٰ بھی کیا ہے، اُن کے کلام کے پیشِ نظر اُن کی خودستائی مبالغہ تصور نہیں کی جا سکتی، کسی شاعر کی قادر الکلامی اور مرتبۂ سخن کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے اُس نے اساتذۂ فن کی تقلید میں ذہنی وسعت، اختراع طرازی، اور جدت پسندی کا کس طرح ثبوت دیا ہے، اگر اُس نے اساتذۂ فن سے سبقت لے جانے کی کوشش کی ہے، تو وہ کہاں تک کامیاب ہوا ہے، عمید ہندوستان کے اُن خوش نصیب شعراء میں سے ہے، جن کے اندازِ بیان سے شمعِ سخن فروزاں ہے، اسی لئے عمید کی شاعرانہ تعلّی حق بجانب ہے، کیونکہ عمید کے کلام میں تمام استادانہ اور فنکارانہ جوہر موجود ہیں، اور وہ خود بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں،

مثلِ عمید تو سخن نادر دوران در زمن
نہ در سپاہان دمین نہ در سمرقند و ہری

عمید نے انوری اور خاقانی کی تقلید میں قصیدے کہے ہیں، اور اپنی جولانیٔ طبع کی نیرنگی دکھائی ہے، مچک، خمک، فرک کے قوافی میں انوری نے صرف ۲۴ اشعار نکالے ہیں، لیکن عمید نے ۴۷ اشعار کہے ہیں، جن کے بیشتر قوافی ایسے ہیں جن تک انوری جیسے عظیم المرتبت شاعر کی رسائی نہ ہو سکی، عمید نے قصیدہ نگاری میں خاقانی کی بھی تقلید کی ہے، عمید کے آفرینش، آشتیش والے قوافی والے قصیدے سے خاقانی کا رنگ واضح ہوتا ہے، سید صباح الدین صاحب نے عمید کی اس خصوصیت پر سیر حاصل بحث کی ہے، اور انھوں نے سید ہاشمی صاحب فریدآبادی کا قول بھی نقل کیا ہے، سید ہاشمی رقمطراز ہیں

قدرتِ کلام اور فصاحت بیان میں عمید اول درجے کے فارسی شعراء میں شمار کیے جانے کا مستحق ہے[1]

عمید نے صنفِ شاعری میں غزل چھوڑ کر نعت گوئی اختیار کی تھی اگر وہ غزلیں لکھتے رہتے، تو شاید اس میدان میں بہت آگے جاتے،

عمید کے نزدیک غزل اور قصیدہ بے فائدہ چیزیں تھیں لہذا اِن اصناف سے اس نے دوری اختیار کر لی تھی، ؎

از غزلم چہ فائدہ یار چو مست ہمنفس
مدح چہ بر دہد کہ شد نقش مراد گور دگر[2]

عمید کی غزل گوئی

عمید کے نزدیک غزل گوئی کوئی نفع بخش یا فائدہ رساں کام نہیں تھا، ایک غزل گو کی حیثیت سے ان کا مقام بلند تھا، لفظی صنعت گری تخیل آرائی اور صنائع و بدائع کے استعمال کے لئے قصیدہ کا میدان ان کے لیے کافی وسیع تھا، تقی اوحدی نے عمید کو استاد کلام اور افتخار الانام کے القاب سے نوازا ہے اور انھیں سحبان بن وائل پر ترجیح دی ہے ؎

فصاحت سحبان در جنب سخانش فصاحت وائل یافتہ[3]

عمید کی غزل گوئی پر ڈاکٹر اقبال حسین نے نہایت جامع اور بلیغ انداز میں تبصرہ کیا ہے، ان کے ..... مبصرانہ خیالات کا اندازہ ان سطور کو پڑھ کر ہو سکتا ہے،

---

[1] بزم مملوکیہ ص ۲۱۵ [2] کلیات بدر و عمید ص ۳۶۲ [3] بزم مملوکیہ ص ۲۱۰

"عمید بڑے باصلاحیت اور جدت پسند شاعر تھے۔ وہ قصیدہ کی پامال زمین سے بہت آگے گئے ہیں، انھوں نے بہت سی غزلیں لکھیں، ان میں سے بعض غزلوں کے اشعار میں لطافت بہادر ۂ اعلیٰ معیار کے ہیں، اور انھوں نے فارسی شاعری کے ذخیرہ کو مالا مال کیا ہے، اُن کے عہد تک بہت ہی کم ہندوستانی شعراء نے غزلگوئی میں اپنی طباعی کا اظہار کیا ہے؟ ان کی غزلوں میں قصیدہ کی خصوصیات پائی جاتی ہیں، اسی کے ساتھ وہ نہایت سلیس و رواں اور خوش آہنگ ہوتی ہیں، عموماً یہ غزلیں سادہ خیالات پر مشتمل ہوتی ہیں، یہ بات قابلِ ذکر ہے، کہ غزل گوئی میں عمید کی امتیازی خصوصیت سادگی اور فطری روانی ہے جس سے ان کی شاعری میں لطافت اور مخصوص ترنم پیدا ہوتا ہے"[1]

ڈاکٹر اقبال حسین نے یہ بات اپنی کتاب میں بڑے وثوق کے ساتھ لکھی ہے، شاید ان کے سامنے عمید کی ساری غزلیں ہوں گی، تبھی انھوں نے اس یقین کے ساتھ اوپر کے اقتباسات میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے،

سید صباح الدین صاحب نے اقبال حسین کی رائے کو غلو پر محمول کیا، ان کا یہ تاثر ان غزلوں کو دیکھ کر تھا، جو تقی اوحدی نے عرفات العاشقین میں بطور نمونہ پیش کی تھیں، لیکن عمید کے نو دریافت مجموعۂ کلام کو دیکھکر سید صاحب کو بھی شاید ڈاکٹر اقبال حسین کا ہم زبان ہونا پڑے، سید صاحب اس بات پر متفق ہیں کہ عمید کو مختلف صنائع و بدائع کے استعمال کا سلیقہ حاصل تھا، وہ ایک چابکدست سخنور تھے، ان کے الفاظ میں عمید کا جوشِ طبع غزل گوئی میں بھی ابھرا اور گو ہندوستان میں اس تغزل کی شراب کو میر حسن اور خسرو

[1] ارلی پرشین پوئٹس آف انڈیا اقبال حسین صفحہ ۲۰۵ [2] بزم مملوکیہ ص ۲۱۶،

نے تیز کیا، لیکن عمید کی قصیدہ نگاری اور غزل گوئی سے جو مئے دو آتشہ پیدا ہوئی، وہ اس لائق ہے کہ اس سے بھی کچھ سرور حاصل کیا جائے، عمید کے قصائد کی عشقیہ تشبیب میں تغزل کی ساری رنگینیاں پائی جاتی ہیں، اس قسم کی تشبیب کو علیحدہ کر لیا جائے تو وہ غزل بن جائے[1]

عمید کے دستیاب شدہ دیوان سے ایک خوبصورت نعتیہ غزل مثال کے طور پر پیش کیجاتی ہے،

ای پیش رخت مہ دو ہفتہ — خورشید صفت ز آب رفتہ
کامل ز جمال تست یک رہ — آئینہ مہ بہر دو ہفتہ
گردون زجناب فرخ تو — قامت راسپہ (رستہ) نیاز خفتہ
دربائی برافت از شب افلند — ہر جامہ زرکہ مہر بغتہ
بدخواہ ترا از خنجر پدر (سپر) — چون پہلو انار سینہ کفتہ
در باب عمید کہ بے تو — دارد جگری زشوق تفتہ

در روز عنانِ دولت
کونین بہ کاب تست خفتہ

مندرجۂ بالا غزل نعتیہ ضرور ہے، لیکن عمید کی یہ اولین کوشش ہر طرح سے قابلِ ستائش ہے، اس میں نہ صرف تغزل موجود ہے، بلکہ اس میں روانی، ترنم، اور حلاوت پائی جاتی ہے، عمید نے نہایت خوبصورت انداز میں غزلوں کو زندگی بخشی ہے، ان میں کشش اور بے ساختگی ہے، عمید نے چھوٹی بحروں میں طبع آزمائی کی ہے، اور انھیں زیادہ سے زیادہ جاندار بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے،

[1] بزم مملوکیہ، از سید صباح الدین ص ۱۵۱،

سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے شہاب الدین ہمرہ کی قصیدہ گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے،

"ہندوستان میں حمد و نعت میں قصائد کہنے کی ادبیت بھی غالباً مولانا شہاب ہی کو حاصل رہی ہے، ان سے پہلے شعراء سلاطین، وزراء اور امراء کی مدح سرائی میں قصیدہ نگاری کا سارا زور صرف کرتے تھے، لیکن مولانا شہاب نے حمد و نعت میں قصائد کہکر اس صنف شاعری میں مذہبی رنگ پیدا کیا"[1]

ایک اور جگہ رقمطراز ہیں ؎

"امیر خسرو اور عمید الدین سنامی نے استاد وقت مولانا شہاب کے تتبع میں حمد و نعت میں کئی قصیدے کہے ہیں۔"[2]

پروفیسر اقبال حسین[3] نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ عمید نے نعتیہ قصائد میں شہاب الدین ہمرہ کا تتبع کیا ہے، عمید کے دستیاب شدہ دیوان کے صفحہ نمبر ۳۲۰ پر ایک نعتیہ قصیدہ ہے جس کا مطلع کرم خوردگی کی بنا پر پورا نہیں پڑھا جاتا۔ راقم کا ایسا گمان ہے کہ عمید نے قوافی کی دلآویزی سے متاثر ہو کر ایک قصیدہ شہاب الدین ہمرہ کے ایک نعتیہ قصیدہ کے تتبع میں کہا ہے جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

الفم بلوح ہستی ہمہ ہیچ در نشانی
شہاب الدین ہمرہ
شہ تخت کن محمد کہ سرادق شرف زد
بسوئے درہمین ز سرائے ام ہانی

بہقائی غیر قائم ز وجود خویش فانی
فضل اللہ عمید
بسی گفتم ازین تا گفتنی د جمع ہم کردم
کجی جمعی کہ ....؟

[1] بزم صوفیہ از سید صباح الدین ص ۱۶۲ [2] ایضاً ص ۱۶۳ [3] ادبی پرشین پوئٹس آف انڈیا ص ۱۶۰

بشرے ملک لطافت فلکی زمین تواضع
چو فلک بہ پاک جسمے چو ملک بہ پاک جانی
گہرے کہ بود جانش بجز انۂ الہی
قمرے کہ تافت نورش ز سپہر جاودانی
ز من آنکہ این قصیدہ طلبیدہ باد جانش
چو قصیدہ ام مزین بجواہر معانی[1]

ز دیوان ہم بخجر دا ینقدر جدا وت کہ رفت
چگویم تا چہ می زاید ازین تلقین شیطانی
نگندم خامہ مدح و غزل از دست گزیری
شدم چون خانۂ باریک و حریم ضعف و نالانی
ذرا نشان دار الطبعم راچنان در مدح ادیار
کہ در صد سال چندان در نثار دابر نیسانی
من اندر شصت این صد و یک بیت پیوستم
ز بعد ششصد و پنجاہ و ہشت ز فضلِ ربانی

ذیل میں عمید کے نعتیہ کلام کے نمونے ہیں۔ جن سے ناظرین کو عمید کی نعت گوئی اور دیگر خصوصیات کا اندازہ ہو سکتا ہے، علاوہ ازیں راقم کی تحقیق کے بموجب عمید ہندوستان کا دوسرا شاعر ہے جس نے نعتیہ قصیدہ نگاری کی روش پر قدم رکھا، اور بقول خود پایگہ سخنوری کو شرفِ قبولیت بخشا ؎

پایگہ سخنوری یافتم از قبول تو
خود ز ازل بعون تو دست مرا ستاین خمک[2]

نعتیہ قصیدہ نمبرا۔

خدا ..... دان از لا الہ الا اللہ
بفیضِ فضلِ زبان عمید حمد سرای
ہزار شکر کہ ز انعام عام تو دارد
دل خدا ای شناس و زبان گوہر رای
ہزار سد ز افاضل کہ زین قسط حمد
عزادہم بلب طوطیان شکرخائی[3]

[1] ادبی پرشین پوئٹس آف انڈیا، از ڈاکٹر اقبال حسین، ص ۶۲-۱۶۸ [2] کلیات بدر و عمید، ص ۲۶۱ [3] ایضاً ص ۲۶۰۔

با اتو شگی بندہ عمید میکند — نظم و ثنا بحضرت تو بقدر ما ملک
این دو سہ حرف مختصر ز بی سگ تو قبول کن — کین سگ خام تو تن درت تست منسلک
حمد تو ثبت بر دلم نعت رسول بر اثر — ہر رقمی کہ زین گذشت آن ز ضمیر باد حک[1]

معمور باد خانہ دین محمدی — در سینہ ام کہ معدن صدف است وجای بند
در شہر از بگوئی ثنا عتش — بکشا دست دیا، عمید نیاز مند[2]

برخیز عمید از ز فرد ست دل تو — بگذر ز غزل حمد خداوندی جہان گو
مداحی درگاہ کسی[3] کن بر افراست — بی زحمت آلات بسی گنبد مینو[4]

عمید نے نہایت مشکل ردیف و قافیہ میں مندرجہ ذیل نعتیہ قصیدہ کہا ہے۔ اسی قصیدے میں انھوں نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جس کے باعث وہ قصیدہ نگاری کی طرف متوجہ ہوئے۔

سپیدہ دم کہ روان شد سوار، قلعہ — نطاق صنعہ (؟) مشرق منطح چرخ چو بندق
ندا د ہاتف عالم بگوش دل بشنیدم — کہ سر ز خواب بر آرای بطوق عشق مطوق
ز درج طبع بیار است بسی جواہر حکمت — ثنا، نعت پیامبر رسول خالق مطلق
چو کور زآئینہ دین زہر کوری حاسد — درین قصیدہ گران کردہ ام (کرم خوردہ) مرق
کہ از برای قدم نیست کین قصیدہ غرا — بگر وہ جملہ مقفیٰ جز از قوافی معلق
بختم نعت عمید است کنون بگوی کہ بادا — شفاعتش بقیامت مرا معین و موافق[5]

عمر بسر شدم بسی در مدحت و غزل — خشک نشد سر قلم یکنفسم صد ہنر

[1] کلیات بدر عمید۔ ص ۲۶۳ [2] ایضاً ص ۲۶۵ [3] منتخب التواریخ از بدایونی ص ۱۰۱ (ترجمہ رینکنگ) میں قند درج ہے [4] کلیات بدر عمید ص ۲۶۵ [5] ایضاً ص ۹۸-۲۹۷

قیمت گوہر سخن وقت دکنون سزد کہ جز — ہر سکوت بر نہم بر سر حیضہ گوہر
درج مدائح و غزل گر بسکوت مہر شد — باز کنم بجبر حق درج معانی از فکر[1]

پناہ بر در شاہ و وزیر کی طلبم — چو آستانہ ختم رسول بندہ دارم
ز آفتاب قبولش بر اوج ماہ کشم — ولی کہ سایہ مثال اندرون چہ دارم[2]

عمید کے مشہور حبسیہ قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ ؎

من کہ چون سیمرغ دریک گوشہ مسکن کردہ ام
ما ورای مرکز خاکی نشیمن کردہ ام
کیفر آن می برم کن نسبت مدح و غزل
ہر گدای را شمہ از شہب زدلان کردہ ام
دو دستی با حرص کردم چون عمید از آز خون
زان قناعت زایدی خویش دشمن کردہ ام
ہستم این یک شعر دیوانی وصد درج گہر
بلکہ ہر بیتش[3] بہ از شعر مدون کردہ ام[4]

عمید کے خالص مدحیہ اشعار ملاحظہ ہوں جو انھوں نے سلطان ناصر الدین شاہ کو مخاطب کر کے کہے ہیں۔ ؎

شاہا بجرم بر سر اہل کرم دار
دستی کہ بر دصورت بجز نیست ہر انگشت

[1] کلیات بدر عمید ص ۳۱۳، [2] ایضاً ص ۳۲۵ [3] بزم مملوکیہ از سید صباح الدین میں "ملون" درج ہے۔ [4] کلیات بدر عمید ص ۳۵۲

مقصود عبید ش بود از غایتِ انصاف

ز آنجا کہ نماید باشارت ہنر انگشت[1]

شاہ زمانہ ناصر دنیا و دین کہ ہست | بوبکر نزغمار یش ناز پل ؟
محمود شہ کہ در صف خدام زیبدشس | چندین ہزار بندہ جنسِ ایاز پل ؟[2]

ہزل گوئی — عبید کے دستیاب شدہ کلام میں انکی ہزل گوئی کی کوئی مثال نہیں ملتی، سید صباح الدین صاحب نے آتشکدہ اور مجمع الفصحاء کے حوالے سے عبید کی ایک ہجو پیش کی ہے اور لکھا ہے کہ اس میں سب و شتم نہیں بلکہ صرف طنز و تشنیع ہے، چھوٹی بحر میں زبان اور طرزِ بیان دونوں بے تکلفانہ ہیں[3]

خواجہ رنجور دلیکن بعجز خواجہ مشغول ولیکن بہ شکم | در تنش باد ولیکن نہ برائے نعمتش باد ولیکن شہد دکم[4]

مناظرہ گوئی — ڈاکٹر اقبال حسین نے عبید کو ہندوستان میں منظوم مناظرہ لکھنے میں اولیت کا شرف بخشا ہے، سید صباح الدین صاحب بھی اس رائے سے متفق ہیں[5]، وہ کہتے ہیں کہ عبید نے یہ مناظرے اسدی طوسی کے رنگ میں کہے ہیں[6]۔ عبید کے منظوم مناظرات "تذکرہ خلاصۃ الاشعار" اور تذکرہ عرفات العاشقین میں پائے جاتے ہیں (ایسا محسوس ہوتا ہے) کہ عبید کا دستیاب شدہ کلام نعتیہ قصائد، غزلوں اور حبیبہ و مدحیہ قصائد پر مبنی ہے، ذیل میں عبید کے "بنگ و شراب" کے مناظرے سے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

دی در میان بادۂ صافی مزاج و بنگ | در مصدرِ دماغ من افتاد شور و چنگ
از تو یکے پیالہ و صد محنتِ خمار | از من طلب علاجِ دل ناتوان و تنگ[7]
من لعل باطراوت و تو سبزۂ بے نمک | نالم شراب صافی و نام تو خشک بنگ[8]

---

[1] کلیات بدر چاچ ص ۳۵، [2] ایضاً ص ۳۵۸ [3] بزم مملوکیہ از سید صباح الدین ص ۲۱۰-۲۱۱ [4] آتشکدہ کے مولف نے عبید کی ہزل گوئی سے متعلق لکھا ہے کہ "این چند بیت از قطعہ کہ در ہزل گفتہ نوشتہ شد از دست بہ گمگفتہ" بزم مملوکیہ ص ۲۱۲ [5] بزم مملوکیہ از سید صباح الدین ص ۲۱۰ [6] ایضاً

تلخیص و تبصرہ

ام المومنین حضرت عائشہؓ کی فقہ اور انکا طرز اجتہاد

از مولانا محمد ایوب صاحب اصلاحی استاذ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر

رسالہ العربی میں ڈاکٹر محمد سلام مدکور نے حضرت عائشہؓ کے اجتہاد پر ایک مضمون لکھا ہے ہم قارئین معارف کی دلچسپی کے لیے اس کا خلاصہ ذیل کی سطور میں پیش کر رہے ہیں۔

حضرت عائشہؓ کا فضل و کمال، ان کی ذہانت و فطانت، علوئے نسب دینی امور و مسائل میں بصیرت اور تفقہ و اجتہاد میں برتری مسلّم ہے، ان کا علمی پایہ متعدد کبار صحابہ سے بلند تھا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قربت کی بنا پر ... ان کو حصول علم کا بڑا موقع تھا، وہ آپ سے دینی مسائل سمجھتیں اور اسلامی تعلیمات کے اسرار و حکم سے واقفیت حاصل کرتیں، ابن سعد کہتے ہیں: "ازواج مطہرات کو بکثرت حدیثیں خوب یاد تھیں، اور حضرت عائشہؓ اور ام سلمہؓ کو ان سب پر مزیت حاصل تھی"، زہری فرماتے ہیں کہ اگر حضرت عائشہؓ کے علم کا موازنہ دوسری ازواج مطہرات اور تمام عورتوں کے علم سے کیا جائے تو حضرت عائشہؓ کو فضیلت حاصل ہوگی، شعرانی کہتے ہیں: "اجتہاد میں حضرت عائشہؓ کا جو درجہ تھا، وہ عورتوں میں کسی کو بھی حاصل نہ تھا، بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے آنحضور صلعم سے دو ہزار سے زیادہ حدیثیں روایت کی ہیں،

حضرت عائشہؓ قرآن و سنت کی اتنی بڑی عالم تھیں کہ سنت نبوی کے متعلق حضرت عمرؓ

و حضرت عثمان رضی اللہ عنہما ان سے رجوع کرتے اور اکابر صحابہ فرائض کے مسائل اُن سے دریافت کرتے تھے، چنانچہ مشہور تابعی مسروق فرماتے ہیں "خدا کی قسم میں نے اکابر صحابہؓ کو فرائض کے متعلق اُن سے سوالات کرتے دیکھا۔"

فقہ و فرائض کی طرح طب، شعر اور ایام عرب کے متعلق حضرت عائشہؓ کو بڑی واقفیت تھی، قبیصہ بن ذویب کا بیان ہے کہ "حضرت عائشہؓ لوگوں میں قرآن و سنت کی سب سے بڑی عالم تھیں"۔ عروہ بن زبیرؓ فرماتے ہیں کہ "میں نے حضرت عائشہؓ سے زیادہ قضا و قائع عرب، فرائض اور طب کا جاننے والا کسی کو نہیں پایا، اور نہ ان سے زیادہ شعر کی روایت کرنے والا دیکھا۔"

حضرت عائشہؓ کا طریقہ اجتہاد

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فقہ کے مدنی اسکول کی اصل و اساس کی حیثیت رکھتی تھیں، ان کی یہ حیثیت ایسے صحابہ کے دور میں تھی، جن سے فقہ کا علم حاصل کیا جاتا تھا، اور فقہائے مدینہ کے طریق اجتہاد میں جن کا نمایاں اثر تھا، چنانچہ بیان کیا جاتا ہے، کہ اہل مدینہ کے مسلک کی بنیاد حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عائشہؓ کے فتوے اور مدینہ کے قاضیوں کے فیصلے ہیں۔

مگر حضرت عائشہؓ کا نہج حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے نہج سے قدرے مختلف تھا، وہ الفاظ اور ان کے مدلول میں کوئی کمی نہیں کرتی تھیں، الفاظ کے مطالب کو پرکھتیں، ان کی گہرائیوں میں اترتیں اور ان کے حقیقی مفہوم و مدعا کا سراغ لگاتیں اور اسباب و علل معلوم کرتیں، کیونکہ انھیں قرآن سے یہ روشنی ملتی تھی کہ وہ عقلوں کو مخاطب کرتا ہے، اور انھیں دعوت فکر و نظر دیتا ہے، اس کے نزدیک عقل ہی تمام دینی و شرعی امور کی مکلف ہے، اسی طرح کی رہنمائی انھیں سنت نبوی سے بھی ملتی تھی، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو معانی و حقائق کی تشریح اور شریعت کے رموز و اسرار سے گہری دلچسپی تھی، ایک شخص نے رسول اللہؐ سے دریافت کیا کہ کوئی

شخص جائز طریق سے اپنی خواہش نفسانی پوری کرتا ہے تو کیا اس کا اجر بھی اسے ملے گا؟ آپ نے فرمایا اچھا، تم ہی بتاؤ اگر وہ ناجائز طریق سے اپنی خواہش پوری کرے تو کیا وہ مجرم ہوگا؟ سائل نے کہا۔ بے شک، تو آپ نے فرمایا۔ پھر اسی طرح اسے ثواب بھی ملے گا۔ جب اسے شر اور بدی کی سزا ملے گی تو خیر اور نیکی کا ثواب اسے کیوں نہیں ملے گا۔

اسی انداز فکر و نظر کی بنا پر حضرت عائشہؓ ان فقیہ صحابہ کے طبقۂ اولیٰ کی اگلی صف میں نظر آتی ہیں جن سے پوری دنیا میں علم پھیلا۔ ان سے بہت سے صحابہ اور تابعین نے کسب فیض کیا، بعض تو ان سے بیحد متاثر ہوئے، ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ قاسم بن محمد بن ابی بکر اور عروہ بن زبیرؓ نے آپ سے خاص طور پر اکتساب فیض کیا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ صرف یہی دو حضرات تھے، جو آپ سے متاثر تھے، بلکہ آپ کے فیض یافتگان اور آپ کے مجتہدانہ طرز کے متبعین بہت تھے، ابن قیم کا منشا تو یہ ہے کہ چونکہ ان دونوں حضرات کا تعلق آپ سے گہرا تھا، اس لئے انھوں نے آپ سے زیادہ روایتیں کیں ورنہ تابعین کی ایک خاصی تعداد ہے جس نے آپ سے روایت کی، ان میں قابل ذکر سعید بن المسیب اور نافع مولیٰ عبداللہ بن عمر ہیں۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ احکام دین کے سلسلہ میں فتوے دیتی تھیں، کیونکہ وہ اُن آٹھ اشخاص میں سے تھیں جو کثرت فتویٰ میں مشہور تھے، اور وہ ہیں۔ حضرت عمر، علی، عائشہ، عبداللہ بن مسعود، زید بن ثابت، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، بشر بن حزم رضی اللہ عنہم، ابن سعد نے طبقات میں بیان کیا ہے،[1] کہ "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے عہد میں اور اپنی وفات تک فتویٰ دیتی رہیں"۔ عبدالرحمٰن بن قاسم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا کہ حضرت عائشہؓ ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے عہد خلافت میں فتویٰ دیتی تھیں، اور یہ سلسلہ

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۳۷۵

تادم مرگ جاری رہا۔ تفسیر، حدیث اور فقہ کی کتابیں ان کے اقوال اور فتاوی سے بھری ہوئی ہیں، جنھیں اگر کبھی جمع کیا گیا تو ایک دفتر بھی اس کے لئے ناکافی ہوگا، عورتوں کے مخصوص مسائل واحکام میں تو وہ ماخذ و مرجع کی حیثیت رکھتی تھیں۔

حضرت عائشہؓ کی فقہ کا ایک امتیاز یہ ہے کہ دلائل کے اضطراب کے وقت ترجیح کے لئے عقل کو حکم مانا جائے اور موازنہ سے کام لیا جائے۔ امام احمد اور مسلم نے عبید بن عمیر سے روایت کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ عورتوں کو غسل جنابت میں اپنے بالوں کو کھولنے کا حکم دیتے تھے، حضرت عائشہؓ نے جب سنا تو اعتراض کیا، اور فرمایا، تعجب ہے ابن عمر پر کہ وہ غسل میں عورتوں کو اپنے سر کے بالوں کو کھولنے کا فتوی دیتے ہیں، کیوں نہیں وہ انھیں اپنے سروں کو مونڈ دینے کا حکم دیتے ہیں! میں نے اور رسول اللہ نے ایک برتن سے غسل کیا، اور میں نے سر پر تین بار سے زیادہ پانی نہیں ڈالا۔"[1] نسائی نے بھی عبید بن عمیر سے روایت کی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا۔ میں اور رسول اللہ اس سے غسل کرتے، (وہاں رکھے ہوئے ایک "فرق" کی طرف اشارہ کیا جو صاع یا صاع سے کم کا پیمانہ ہے۔) تو میں اپنے سر پر اپنے ہاتھوں سے تین بار پانی بہاتی، اور اپنے بال نہ کھولتی"[2]

حضرت عائشہؓ نے عبداللہ بن عمرؓ کے خیال کو تسلیم نہیں کیا، اس لئے کہ انھیں اس مسئلہ سے عملی واقفیت تھی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کے غسل جنابت میں سر پر صرف تین بار پانی ڈالنے اور بال نہ کھولنے پر سکوت اختیار فرمایا تھا، چونکہ ابن عمرؓ کا قول حضرت عائشہؓ کے عمل اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے "اقرار" سے معارض تھا، اس لئے آپ نے اسے قبول نہیں فرمایا۔

---

[1] البخاری بشرح عمدۃ القاری ج ۳ ص ۲۰۰۔ [2] دوسرے لوگ دوسری روایتوں کی بنیاد پر بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچ جانے کو ضروری سمجھتے ہیں۔

صحاح کی روایت ہے کہ ایک عورت نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا۔ کیا حائضہ نماز کی قضا کرے گی؟ تو آپ نے فرمایا۔ تم حروری تو نہیں ہو؟[1] ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حالت حیض میں ہوتے تھے تو ہمیں روزوں کی قضا کا حکم دیا جاتا، نمازوں کی قضا کا نہیں۔ حضرت عائشہؓ نے اس فرق کی کوئی علت نہیں بتائی، کیونکہ ان کے نزدیک تعبدی امور میں سبب نہیں دیکھا جائے گا۔

حضرت عائشہؓ کے اجتہاد میں مصلحت کی رعایت

حضرت عائشہؓ کے اجتہادات میں مصلحت کی رعایت بہت ہے، چنانچہ وہ مصالح کا لحاظ کر کے حکم بدل دیتی تھیں، حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لا تمنعوا إماء الله مساجد الله	اللہ کی بندیوں کو مسجدوں میں نماز ادا
ولكن ليخرجن تفلات	کرنے سے نہ روکو البتہ سادہ انداز میں
	آئیں، بن سنور کر نہ آئیں۔

لیکن حضرت عائشہؓ نے اس حدیث سے یہ استنباط فرمایا کہ عورتوں کے نکلنے کی اجازت میں فتنہ پیدا ہونے کا خاص لحاظ کیا گیا ہے، ورنہ معاشرہ میں خرابی رونما ہوگی، چنانچہ جب کچھ لوگوں میں انحراف کی صورت دیکھی اور عورتوں کے نکلنے میں فساد نظر آیا تو فرمایا، جیسا کہ بخاری، مسلم اور احمد کی روایت ہے۔

لو أدرك رسول الله ﷺ ما	اگر رسول اللہؐ کو یہ حالت معلوم ہوتی
أحدث النساء لمنعهن	تو وہ انھیں مسجدوں میں جانے سے
المساجد	روک دیتے۔

---

[1] حروری خوارج کو کہتے ہیں، خوارج کا ایک فرقہ حائض کی نمازوں کے قضا کا قائل تھا۔

حضرت عائشہؓ نے عورتوں کو مسجدوں میں جانے سے ممانعت کی وجہ زمانے کے فساد اور خرابی کو بتایا، اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو ان لفظوں میں مروی ہے،[1]

لاتمنعوا النساء أن يخرجن	عورتوں کو مسجدوں میں جانے سے نہ
إلى المساجد وبيوتهن	روکو اور ان کے گھر ان کے لیے زیادہ
خير لهن۔	بہتر ہیں۔

کبھی کبھی حضرت عائشہؓ ایسی حدیثوں کو جو نص قرآنی کے عموم کے خلاف ہوتی تھیں، قبول نہیں کرتی تھیں، اور ایسا اُس وقت کرتیں جب وہ حدیث راوی کے غیر معتبر ہونے کی وجہ سے ان کے نزدیک صحیح نہیں ہوتی، مثلاً روایت ہے کہ فاطمہ بنت قیس کو انکے شوہر نے طلاق بائن دی، اور وہ غائب تھے، جب فاطمہ نے ان سے نفقہ کا مطالبہ کیا تو انھوں نے کہا "خدا کی قسم تمہارا کوئی حق ہم پر نہیں ہے"۔ جب فاطمہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ ان پر تمہارا نفقہ نہیں ہے، اور فاطمہ کو ابن ام مکتومؓ کے یہاں عدت گذارنے کا حکم دیا، حضرت عائشہؓ نے اس حدیث کو تسلیم نہیں کیا کیونکہ اولاً انھیں اس روایت پر اعتماد نہیں تھا، ثانیاً یہ حدیث مطلقہ عورتوں کے سلسلہ میں نص قرآنی کے عموم کے خلاف ہے۔ اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے۔[2]

أسكنوهن من حيث سكنتم	ان کو گھر دو رہنے کے واسطے جہاں تم
من وجدكم	آپ رہو مقدور کے مطابق

دوسری جگہ ہے۔[3]

لاتخرجوهن من بيوتهن	مت نکالو ان کو ان کے گھروں سے

---

[1] رواہ احمد ابوداؤد ملاحظہ ہو نیل الاوطار للشوکانی جزء ثالث [2] سورہ طلاق آیت ۶ [3] ایضاً آیت ۱

روکنے کی وجہ سے نفقہ واجب ہوتا ہے، اس سلسلہ میں حضرت عائشہؓ کی تائید اسامہ بن زیدؓ اور عمر بن الخطابؓ نے فرمائی اور حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ ہم خدا کی کتاب اور رسول اللہ کی سنت ایک ایسی عورت کے کہنے پر ہرگز ترک نہیں کرینگے جس کے متعلق ہمیں نہیں معلوم کہ اسے بات یاد رہی یا بھول گئی۔ (رواہ ابن ماجہ)

حضرت عائشہؓ کی ژرف نگاہی اور باریک بینی، حضرت عائشہؓ فہم سلیم کی مالک تھیں، سنت رسول کے سلسلہ میں کوئی بات سنتیں تو کتاب اللہ کے آئینے میں اسے دیکھتیں اور پرکھتیں، معانی و مطالب کی گہرائیوں میں اترتیں اور صحیح مفہوم اخذ کرتیں۔ اسکی واضح مثال قرآن مجید کی آیت[1]

ولقد رآه نزلة أخرى	اور اسکو اس نے دیکھا دوسری بار اترتے
عند سدرة المنتهى۔	سدرۃ المنتہی کے پاس۔

کی تاویل ہے، بعض لوگوں نے اس آیت کا مفہوم یہ سمجھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کو دیکھا ہے، حضرت عائشہؓ نے اس سے اختلاف کیا، بخاری میں ہے کہ مسروق نے فرمایا میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا ام المومنین! محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کو دیکھا۔ آپؓ نے فرمایا تمہاری اس بات سے تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، تم سے جس نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا اس نے جھوٹ کہا، پھر قرآن مجید کی آیت کریمہ کی تلاوت فرمائی۔[2]

لاتدركه الأبصار وهو	نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں
يدرك الأبصار۔[3]	اور وہ نگاہوں کا ادراک کر لیتا ہے،

پہلی آیت مجمل تھی جس کا مفہوم سمجھنے میں لوگوں نے غلطی کی، اس کی توضیح قرآن مجید کی ایک دوسری مفصل آیت کے ذریعہ کر لی۔

---

[1] سورہ نجم آیت ۱۳، ۱۴۔ [2] سورہ انعام آیت ۱۰۳۔ [3] ملاحظہ ہو "الاصابہ فیما استدرکتہ السیدۃ عائشۃ علی الصحابہ" للزرکشی ص ۷۶

شیخین نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ "مردہ پر اس کے گھر والوں کے رونے سے عذاب ہوتا ہے"، اس بنا پر عام لوگوں کا یہی عقیدہ بن گیا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اسے تسلیم نہیں کیا، اور سورہ انعام کی یہ آیت پڑھی [1]

ولا تزر وازرة وزر أخرى — اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔

پھر فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خاص یہودیہ کے متعلق فرمایا تھا کہ اس کے گھر والے اس پر رو رہے ہیں، اور قبر میں اس پر عذاب ہو رہا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کی نگاہ محض الفاظ کے ظاہری حکم تک محدود نہیں رہ جاتی تھی، بلکہ معانی، اسباب اور مواقع کی جستجو میں مصروف رہتی تھی۔

اخبار احاد کے بارے میں حضرت عائشہؓ کا موقف

خبر واحد کو قبول کرنے میں ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ کتاب اللہ کی طرف رجوع کرتیں اور روایت کے مفہوم کو سمجھنے میں دقت نظر سے کام لیتیں اور اس کی صحت پر اطمینان حاصل کرنے کے لیے کبھی ایک طویل عرصہ کے بعد راوی سے وہی حدیث بیان کرنے کی فرمائش کرتیں، اگر وہ کسی کمی بیشی کے بغیر بعینہ ان ہی الفاظ میں بیان کر دیتا جن الفاظ میں پہلی مرتبہ بیان کیا تھا تو قبول کر لیتیں، ایک بار حضرت عائشہؓ نے عروہ بن زبیرؓ سے فرمایا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ عبداللہ بن عمروؓ بن العاص حج کو جا رہے ہیں، تم ان سے ملاقات کرو اور کچھ دریافت کرو کیونکہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اکتساب فیض کیا ہے، عروہ فرماتے ہیں، عبداللہ بن عمروؓ بن العاص سے ملا اور ان سے کچھ حدیثیں بیان کرنے کی درخواست کی تو انھوں نے بیان کیا کہ

[1] سورہ انعام آیت ۱۶۴

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

ان اللہ لا ینزع العلم من الناس انتزاعا ولکن ینزع العلم بقبض العلماء — اللہ تعالیٰ علم کو لوگوں سے کھینچ کر نہیں نکالے گا، بلکہ علماء اٹھتے جائیں گے اس طرح علم اٹھ جائے گا،

حضرت عروہؓ فرماتے ہیں کہ جب میں نے یہ حدیث حضرت عائشہؓ سے بیان کی تو انھیں بڑی حیرت ہوئی اور انھوں نے تسلیم نہیں کیا، اگلے سال پھر انھوں نے مجھ سے کہا کہ ابن عمروؓ آ گئے ہیں، ان سے ملو اور علم کے بارے میں اس حدیث کو ان سے پوچھو، چنانچہ میں ان سے ملا اور پوچھا تو من و عن اسی طرح بیان کیا، جس طرح پہلی دفعہ بیان کیا تھا، عروہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے حضرت عائشہؓ کو بتایا تو انھوں نے فرمایا میرا خیال ہے، انھوں نے سچ کہا، کیونکہ انھوں نے اس میں کوئی کمی بیشی نہیں کی،

حضرت عائشہؓ کسی بھی حدیث کو محض سن کر قبول نہیں کر لیتی تھیں، بلکہ وہ اپنی معلومات کی روشنی میں اس پر غور کرتیں، پھر جب حدیث کی صحت پر اطمینان ہو جاتا، تو اسے قبول فرماتی تھیں،

حضرت عائشہؓ کے اجتہاد میں کتاب وسنت کا مقام

حضرت عائشہؓ کے اجتہادات کے کچھ بنیادی اصول تھے، وہ بھی دوسرے مجتہدین کی طرح کتاب اللہ کو اولین اساس قرار دیتی تھیں، پھر سنت کو جس کے متعلق ان کی رائے یہ ہے کہ جب وہ صحیح ہوگی تو یا تو وہ کتاب اللہ کے اجمال کی وضاحت کرتی ہوگی، یا اس کی توضیح و تفصیل،

ان کے نزدیک سنت قرآن کی تخصیص بھی کرتی ہے، مثلاً سورۃ النساء میں ارشاد ہے [1]

حرمت علیکم امهاتکم — تمھارے اوپر حرام کی گئیں تمھاری مائیں
وبناتکم واخواتکم وعماتکم — اور تمھاری بیٹیاں اور تمھاری بہنیں اور

[1] سورۃ النساء آیت ۲۳

وخالاتکم وبنات الاخ	تمھاری پھوپھیاں اور تمھاری خالائیں
وبنات الاخت وامھاتکم	اور بھائی کی بیٹیاں اور بہن کی بیٹیاں
اللاتی ارضعنکم واخواتکم	اور تمھاری وہ مائیں جنھوں نے تمھیں دودھ
من الرضاعۃ الآیۃ	پلایا ہے، اور تمھاری دودھ شریک بہنیں،

تحریم کے سلسلہ میں یہ آیت نص قطعی ہونے کے باوجود اپنی مقدار، وقت نیز اس باب میں کہ تحریم کس کی جانب سے ہوگی مجمل ہے، چنانچہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا حضرت حمزہؓ کی صاحبزادی کے متعلق فرمایا کہ وہ میرے لیے حلال نہیں ہے کیونکہ وہ میرے رضاعی بھائی کی لڑکی ہے، جو نسب سے حرام ہوتا ہے وہ رضاعت سے حرام ہوتا ہے، اسی طرح حضرت عائشہؓ کی ایک روایت میں سنت نے آیت کے مطلق حکم کو مقید کر دیا، مطلق حکم میں نہ تو اس بات کا ذکر ہے کہ کتنی بار پلانا موجب تحریم ہے، اور نہ اس کا ذکر ہے کہ ایک بار میں کتنی مقدار میں دودھ پلانا موجب تحریم ہے، حضرت عائشہؓ کی روایت ہے، پانچ گھونٹ پلانا جس سے شکم سیری ہوجائے، موجب تحریم ہے، لیکن دوسرے لوگ آیت کے اطلاق کی بنا پر ایک قطرہ دودھ پی لینے پر بھی رضاعت کے احکام نافذ کرتے ہیں۔

اسیطرح جب ازواج مطہراتؓ نے آیت میراث کی بنیاد پر اپنی میراث کا مطالبہ کیا تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا، ہمارے لئے میراث نہیں ہے، اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

انا معاشر الانبیاء لا نورث	ہم جماعت انبیاء کی وراثت نہیں چلتی،
ولا نورث ما ترکناہ صدقۃ[1]	ہم جو کچھ چھوڑتے ہیں صدقہ ہوتا ہے،

[1] رواہ ابویعلی عن حذیفہ بسند صحیح

حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے حضرت عثمان، عبدالرحمن بن عوف، زبیر، سعد، علی، عباس رضی اللہ عنہم سے فرمایا "اس ذات کی قسم دلاکر تم سے پوچھتا ہوں جس کی اجازت سے آسمان و زمین قائم ہیں کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہمارا ترکہ وراثۃ میں تقسیم نہیں ہوگا بلکہ صدقہ ہوگا، ان حضرات نے اثبات میں جواب دیا اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عائشہؓ نے حدیث کی بنیاد پر کتاب کے عموم میں تخصیص کردی۔

اسی طرح ان کے اجتہادات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نصوص تشریعی میں مفہوم مخالف سے بھی کام لیتیں اس کی دلیل یہ ہے کہ ان کے نزدیک اس مسافر کے لیے جو حالت امن میں ہو اتمام نماز ضروری ہے، قصر کا حکم صرف ان مسافرون کے لیے ہے جو حالت خوف میں ہوں، اس لئے کہ آیت میں ہے[1]

واذا ضربتم فی الارض	اور جب تم سفر کرو زمین میں تو تم پر کوئی گناہ
فلیس علیکم جناح ان تقصروا	نہیں ہے اگر کم کرو نماز میں سے اگر
من الصلاۃ ان خفتم ان	تم کو ڈر ہو کہ ستادیں گے تم کو
یفتنکم الذین کفروا	کافر۔

جب ان سے کہا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قصر فرماتے تھے، تو انھوں نے جواب دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسوقت قصر فرماتے تھے، جب وہ جنگ اور خوف کی حالت میں ہوتے، کیا تم لوگوں کو بھی کوئی خوف ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے مفہوم مخالف کو اختیار کیا، ابن جریر نے اپنی تفسیر میں روایت کی ہے، اور شوکانی نے اسے نقل کیا ہے، کہ حضرت عائشہؓ سفر میں چار رکعت پڑھتیں، جب لوگوں نے اعتراض کیا

[1] سورہ نساء آیت ۱۰۱

تو فرمایا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم جنگ اور خوف کی حالت میں ہوتے تھے، کیا تم لوگوں کو بھی کوئی خطرہ ہے، لیکن دوسری روایتوں اور اس عمل کی بنا پر جو فتح مکہ کے بعد آپ کا تھا نیز اس بنا پر کہ خلفاء راشدین کے زمانہ میں جب اسلام کے مخالفین زیر ہو چکے تھے، اور اسلام کا بول بالا تھا، اکابر صحابہ قصر کرتے رہے، دوسرے لوگ قصر کو ضروری سمجھتے ہیں،

حضرت عائشہؓ کی مجتہدانہ حیثیت کے اندازہ کے لیے سطور بالا کافی ہیں وہ کتاب و سنت سے پوری واقفیت اور اپنی فکر و نظر کی وجہ سے اصحاب حدیث اور صاحبان اجتہاد و قیاس دونوں حلقوں میں یکساں مقبول ہیں، مدینہ کے فقہاء پر ان کے اثرات حضرت عمر بن الخطابؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ سے کسی طرح کم نہیں،

حافظ ذہبیؒ کا یہ بیان کتنا صحیح ہے کہ سعید بن مسیب، نافع مولٰے عبد اللہ اور بہت سے لوگوں نے روایت کی ہے کہ۔ . . . .

ام المومنین حضرت عائشہؓ کا کیا کہنا، بچپن ہی سے انھیں ایسا ماحول ملا جو اسلامی تعلیمات کا گہوارہ تھا، ایسے باپ کے آغوش میں تربیت پائی جنھیں مردوں میں ایمان و اسلام اور اتباع رسول میں اولیت کا شرف حاصل تھا، اور ایسے شوہر کی رفاقت میسر آئی جو صاحب شریعت تھا، در . . . تمام ازواج مطہرات میں آپ سب سے زیادہ محبوب تھیں، اس لیے قدرتی طور پر آپ کو اسلامی تعلیمات و احکام کو حضور سے زیادہ سننے اور سیکھنے کے مواقع ملے، اور حضور کے فیض صحبت کے اثر سے آپ کا مزاج اسلامی قانون سازی کے سانچے میں ڈھل گیا اور اسرار شریعت کے فہم میں زبردست درک حاصل ہو گیا، یہاں تک کہ اسلامی قانون کی ایک ماہر خاتون ہو گئیں۔

اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو اور دین کے فہم اور اس کے احکام پر عمل اور اس سے غیر معمولی تعلق اور شغف میں تمام مسلمان عورتوں کے لیے انھیں بہترین اسوہ اور نمونہ بنائے!

وفیات

ڈاکٹر میر ولی الدین مرحوم،

افسوس ہے یکم دسمبر ۱۹۷۵ء کو نامور فلسفی و صوفی اور مشہور مصنف و معلم ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب نے اپنے وطن حیدرآباد میں انتقال کیا، وہ اسی کے پیٹے میں تھے، ایک سال سے انکی علالت کا سلسلہ جاری تھا، مرحوم کی تعلیم جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں ہوئی، یہاں سے فلسفہ میں ایم۔ اے کرنے کے بعد لندن تشریف لیگئے، بیرسٹری کی تعلیم کے ساتھ کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفہ کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی، ۱۹۳۳ء میں جامعہ عثمانیہ میں فلسفہ کے استاذ مقرر ہوئے اور پھر اسی شعبہ کے صدر ہو کر سنہ۶ء میں ریٹائر ہوئے، ادھر کئی سال سے خانہ نشین ہو گئے تھے، تاہم تصنیف و تالیف کا مشغلہ جاری تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے اردو اور انگریزی میں بہت سی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، انگریزی اور عربی کی بعض کتابوں کے ترجمے بھی کیے، ان کو دار المصنفین سے بھی بڑا تعلق تھا، ایک زمانہ میں ان کے مضامین معارف میں برابر شائع ہوتے رہے، انکی پہلی کتاب "فلسفہ کی پہلی کتاب" یہیں سے چھپی تھی، یہ ریبو بارٹ کی پرابلمز آف فلاسفی کا اردو ترجمہ ہے جس کو انھوں نے جامعہ عثمانیہ کے سلسلۂ نصاب تعلیم کیلئے تیار کیا تھا، ایک رسالہ "اخلاقیات" کے نام سے بھی ایک کتاب میٹرک کے نصاب کیلئے لکھی تھی "مراقبات" ان کی اہم کتاب ہے، یہ بظاہر تو حزب و اوراد کی کتاب معلوم ہوتی ہے مگر نفسیات کے اس مسلمہ اصول کے مطابق کہ انسان پر جس قسم کے خیالات کا غلبہ ہوتا ہے، اسی قسم کے اثرات اس کے خارجی اور باطنی وجود میں بھی لازماً ظاہر ہوتے ہیں، انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ دینی تعلیمات اور ایمانیات و عقائد پر پختہ یقین و ایمان نہ صرف مذہبی عقیدت کے لحاظ سے بلکہ نفسیاتی اصول سے بھی انسان کی اخروی فلاح اور دنیاوی و مادی کامرانیوں کا ضامن ہے، گو بعض صوفیہ نے بھی اس نکتہ کی جانب اشارہ کیا ہے،

مگر جدید نفسیات کی روشنی میں سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب ہی نے اس حقیقت کو شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا ہے،
ڈاکٹر صاحب کا اصل موضوع فلسفہ تھا، مگر حقیقۃً وہ ایک مرد مومن اور عارف باللہ تھے، اسلئے وہ فلسفہ
کے برے اثرات و نتائج سے ہمیشہ محفوظ رہے، انکی فلسفیانہ تحریریں بھی ایمان کی لذت و لطافت سے معمور
ہوتی ہیں، اور وہ خالص فلسفہ کی کتابوں میں بھی پہلے قرآنی فلسفہ بیان کرتے ہیں، کیونکہ قلب حکمت
ایمانی سے منور ہونے کے بعد عقل خود دین کا غلام نہیں بن سکتا، تصوف اور قرآنیات پر انکی کتابیں بڑی
پر مغز ہیں جیسے قرآن اور تصوف، قرآن اور تعمیر سیرت، علامات خوف و حزن اور انگریزی میں [illegible]
[illegible] وغیرہ، ان میں اسلامی تصوف و احسان کی وضاحت کرکے تصوف اور صوفیہ پر اعتراضات
کا جواب دیا گیا ہے اور اسکی تائید میں قرآن و حدیث سے سندیں اور اکابر صوفیہ کے اقوال بھی پیش کئے گئے ہیں
ڈاکٹر صاحب کی ذات قدیم و جدید کا سنگم تھی، وہ جدید علوم و فلسفہ سے پوری طرح باخبر تھے اسلئے انکی کتابوں میں
علمی و کلامی بحث و استدلال بھی ہوتا ہے اور وہ عام صوفیانہ کتابوں کی طرح ضعیف روایتوں اور حکایتوں
سے بڑی حد تک خالی ہوتی ہیں،

ڈاکٹر صاحب کے انداز بیان کی شگفتگی و دلکشی نے فلسفہ کے خشک اور دقیق موضوع میں شعر و ادب جیسی لطافت
و دلآویزی پیدا کر دی ہے، تصوف میں ذوقی اور وجدانی باتیں ہوتی ہیں اور کیفیات و ذوقیات کو تعقلات کی
زبان میں ادا کرنا بہت مشکل ہوتا ہے، مگر ان مباحث کو بھی وہ اس قدر سلجھے انداز میں بیان کرتے ہیں کہ عام
قاری کو انکے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر صاحب صوم و صلوٰۃ کے نہایت پابند اور تہجد گزار تھے، تہجد کے بعد فجر تک اوراد و وظائف میں مشغول رہتے، حضرت مولانا
محمد حسین صاحب حیدرآبادی سے بیعت و ارادت کا تعلق تھا، انکے نام اپنی اکثر کتابیں بڑی عقیدت سے معنون کی ہیں، خود ڈاکٹر صاحب کی صحبت سے
بھی بہت سے لوگوں کو فیض پہنچا، زندگی کے ہر دور میں انکی پختہ دینداری قائم رہی، لندن کے مناظر بھی انکی نگاہوں کو خیرہ نہ کر سکے، انکا دماغ
فلسفہ جدید سے روشن تھا مگر دل ہمیشہ ایمان سے منور رہا، اب ایسے لوگ بہت کم ہو گئے جو حکیمانہ دماغ اور فلسفیانہ ذوق کے ساتھ نگاہ بھی رکھتے تھے
دل آگاہ اور چشم بینا بھی رکھتے ہوں، اللہ تعالیٰ اپنے اس مخلص بندہ اور علم کے خادم کو اپنی رحمت کاملہ سے نوازے اور انکے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، (آمین)

مطبوعات جدیدہ

تبلیغی نصاب جلد اول ۔ از شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت
عمدہ، خوبصورت جلد، مجموعی صفحات ۸۰۰، قیمت تحریر نہیں، پتہ ۔ ربانی بکڈپو، کٹرہ شیخ چاند، لال کنواں دہلی

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نے بعض عبادات و اعمال کے فضائل و برکات پر جو رسالے
لکھے ہیں وہ بہت مقبول ہوئے، اور ان کی حیثیت تبلیغی نصاب کی ہو گئی ہے، اب ربانی بکڈپو نے اس
مفید سلسلے کے حسب ذیل سات رسالوں کو ایک ہی جلد میں یکجا کر دیا ہے، حکایات صحابہؓ، فضائل نماز،
فضائل ذکر، فضائل تبلیغ، فضائل قرآن، فضائل رمضان، فضائل درود، پہلا رسالہ صحابہ کرام کی
خشیت الٰہی، اطاعت و محبت رسول، زہد و انفاق فی سبیل اللہ اور دین کی راہ میں مصائب جھیلنے کے موثر
واقعات پر مشتمل ہے، دوسرے رسالوں میں مذکورہ اعمال و عبادات کی فضیلت و اہمیت کے متعلق آیتوں
اور حدیثوں کی دلنشین تشریح کی گئی ہے، ان رسالوں کے مطالعہ سے عمل کا شوق پیدا ہوتا ہے، فضائل و ترغیبات
کے بیان میں کچھ روایتیں ضعیف بھی آگئی ہیں، اس بنا پر اصل عربی روایتوں کے آخر میں ان کے ضعف کا ذکر بھی کر دیا
گیا ہے، کیا اچھا ہوتا کہ ترجموں کے آگے بھی یہ لکھ دیا جاتا، تاکہ اردو داں بھی اس سے واقف ہو جاتے، یہ رسالے مولوی
محمد طارق صاحب کے بعض حواشی پر بھی مشتمل ہیں۔

لکھنؤ کی لسانی خدمات ۔ مرتبہ جناب ڈاکٹر حامد اللہ ندوی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ عمدہ،
کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۷۰، مجلد مع گرد پوش۔ قیمت:- عـہ ۱۲/

پتہ:- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی

دلی کے بعد لکھنؤ اردو زبان کا دوسرا بڑا مرکز تھا بلکہ زبان کو سنوارنے اور اسکے نوک پلک درست کرنے میں

اس کو دلی پر بھی یک گونہ فوقیت ہے لیکن لکھنؤ کے شعری و ادبی کارناموں کی طرح اس کی لسانی خدمات کی جانب زیادہ اعتنا نہیں کیا گیا ہے، اس لئے اس کتاب میں اس کی لسانی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے، یہ تین حصوں پر مشتمل ہے، تمہید، تعارف، تبصرہ، پہلے حصہ میں بطور پس منظر زبان کی نشو و نما اور عہد بعہد ارتقاء پر مختصر گفتگو ہے، دوسرے میں زبان و بیان، روزمرہ و محاورہ، صرف و نحو، عروض و قواعد اور لغات و امثال کی ترتیب و تدوین میں حصہ لینے والے اٹھائیس (۲۸) لکھنوی مصنفین کا تذکرہ ہے اس میں پہلے ان مصنفین کے مختصر حالات و کمالات اور آخر میں لسانی خدمات کا مرقع پیش کیا گیا ہے، یہ حصہ انشاؔ و ناسخؔ سے شروع ہو کر احتشامؔ حسین مرحوم اور مسعود حسینؔ خان (وائس چانسلر جامعہ ملیہ) پر ختم ہوا ہے، درمیان میں مظفرؔ علی اسیرؔ، قدرؔ بلگرامی، امیرؔ مینائی، جلالؔ، مرزا محمد ہادی رسواؔ، نظم طباطبائی، جلیل مانک پوری، مرزا محمد عسکری، حسرت موہانی، نیاز فتحپوری، اثر لکھنوی اور مسعود حسن ادیب وغیرہ ارباب کمال اور مشاہیر زبان و ادب کا تذکرہ ہے، اس حصہ میں جن لوگوں کا ذکر ہے، ان میں بعض کا اصل وطن لکھنؤ نہیں ہے، تاہم یا تو وہ اس کے مضافات کے تھے یا ان کی عمر کا زیادہ حصہ یہیں بسر ہوا تھا، تیسرے حصہ میں لسانیات کے مختلف پہلوؤں پر لکھنؤ کی خدمات پر اجمالی تبصرہ ہے، یہ کتاب محنت سے لکھی گئی ہے، اور اس سے لکھنؤ کی لسانی خدمات کا مختصر خاکہ بھی سامنے آجاتا ہے، مگر مختصر ہونے کی وجہ سے تشنگی باقی رہتی ہے، تعجب ہے کہ مآخذ میں شعر الہند کا ذکر نہیں ہے، اس میں لکھنؤ خصوصاً ناسخ کی اصلاح زبان کا مفصل ذکر ہے، اسکے علاوہ مولانا عبد السلامؒ نے "دلی اور لکھنؤ کی شاعری اور ایک کا اثر دوسرے پر" کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا تھا، جو مقالات عبد السلامؒ میں شامل ہے، اس سے بھی بہت کچھ استفادہ کیا جا سکتا تھا۔

"ض"

جلد ۱۱۷ ماہ فروری ۱۹۷۶ء مطابق ماہ صفر المظفر ۱۳۹۶ھ عدد ۲

مضامین